اندر کا درد
قاضی ہلال دلنوی

اندر کا درد

(پنجابی افسانے۔ کرن سنگھ طالب کشمیری)

اردو ترجمہ

قاضی ہلال دلنوی

ناشر۔ قاضی منظور پبلی کیشنز دلنہ بارہمولہ کشمیر

کتاب	:	اندر کا درد
افسانہ نگار	:	سردار کرن سنگھ طالب (پنجابی)
ترجمہ (اردو)	:	قاضی ہلاآل دلنوی
کمپوزنگ	:	شاہین کمپیوٹرس سوپور کشمیر
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	دوسو ۲۰۰ روپے
سال اشاعت	:	2018

کتاب ملنے کا پتہ

۱)۔قاضی ہلاآل دلنوی۔ دلنہ بارہمولہ کشمیر 193103

۲)۔کتاب گھر۔امیرا کدل سرنگر کشمیر

۳)۔کرن سنگھ طالب۔ چک کانسپورہ بارہمولہ کشمیر 193103

فہرست

ا۔ اندر کا درد

سچ پوچھو تو ایسا حادثہ نہ کبھی سنا نہ دیکھا۔ اُن کی ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اس کی درد بھری چیخیں سُن کر آسمان بھی آنسو بہا رہا تھا۔ اُدھر بہویں آہ وزاری کر رہی تھیں کہ سُن کر کلیجہ پھٹ رہا تھا۔

پورا گاؤں یہ ماتم دیکھ کر بیقراری سے تڑپ اٹھا تھا۔

یہ سچ ہے کہ بیٹے سبھی کے مرتے دیکھے ہیں۔ لیکن چاچی اس قدر رو رہی تھی لگتا تھا جیسے بس اُسی کا بیٹا مر گیا ہو۔

یوں تو اس گاؤں کے لوگوں کو جیسے بیٹے مروانے کی عادت ہی ہو گئی ہے۔

میں نے 'جیتے' سے کہا ''بھائی ذرا تو ہی چاچی کو چُپ کرا۔ اسے ذرا تسلی تو دے''۔ 'جیتا' آہیں بھرتے ہوئے کہنے لگا ''چاچا۔ آخر وہ ماں ہے۔ روئے چلائے نہیں تو اور کیا کرے''۔ دوسری طرف دونوں بہویں جنہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس کا سہاگ اُجڑ گیا ہے ان سے کون کہے کہ مت رو۔ چاچی نے دونوں کو اکٹھے پالا پوسا تھا۔ دونوں کی شکل وصورت بالکل ایک جیسی۔ کوئی ان کو دیکھکر فرق نہیں کر سکتا کہ ان میں

'لابھا' کون ہے اور 'کالا' کون۔

زیادہ نہیں چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے کہ پہلے لابھا کو اور بعد میں کالا کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔ یہ سلسلہ پچھلے کئی سال سے رُکنے میں نہیں آرہا تھا کہ پولیس جوانوں کو پکڑ کر لے جاتی۔ کئی ایک کو پولیس کے ساتھ لڑتے ہوئے دکھا کر مارا جاتا۔ اس وجہ سے گاؤں والوں کو موت کے رقص کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

ماں باپ کو اب پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس کا بیٹا مارا گیا۔

میں نے کئی بار پولیس تھانوں میں رپورٹ درج کرائی لیکن کوئی پتہ نہیں چلا۔ نہ ہی حکومت نے اب تک کبھی اس کی طرف کوئی توجہ دی۔ چاچی کو تسلی دے کر چُپ کراتا اور کبھی کبھی وہ بھی یہ سوچ کر چپ ہو جاتی کہ سبھی کے تو۔۔۔۔۔

میں ورنڈا میں بیٹھا تھا اور چاچا نے دوسری طرف بیٹھے بیٹھے آواز دی 'بلو! بات سُن میں کھیت پر جا رہا ہوں۔ اِدھر ذرا خیال رکھنا۔ اندر لابھے کا ننھا بچہ سو رہا ہے گھر میں کوئی نہیں ہے وہ سب شادی میں گئے ہیں۔ میں نے چاچا کو چوراہے تک جاتے دیکھا لیکن جلدی ہی وہ

میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سب لوگ رات پڑنے سے پہلے شادی سے واپس آئے۔ رات ہونے لگی۔ جوں جوں اندھیرا بڑھنے لگا۔ چاچی پریشان ہونے لگی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیونکہ کئی بار ایسا ہو بھی گیا کہ گاؤں سے کوئی کھیتوں میں گیا لیکن مڑ کر واپس نہیں آیا۔ کالا اور لا بھا بھی کئی بار کھیتوں میں جانے کو تیار ہوئے لیکن چاچی نے جانے نہیں دیا۔

سب کہہ رہے تھے کہ چاچا کو جانے ہی نہیں دینا چاہئے تھا۔ لیکن گھر میں کوئی نہیں تھا کون روکتا۔ چاچی کہنے لگی "رات آدھی سے زیادہ بیت گئی۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئے"۔ لیکن باہر جانے کیلئے کوئی تیار نہیں تھا۔ جاتا بھی کون دن ڈھلتے ہی کرفیو لگ جاتا ہے۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ چاچی کا رو رو کر بُرا حال ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی میں تھانے پہنچا۔ لیکن چاچا کا کوئی پتہ نہ چلا۔ تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔ کھیتوں میں تلاش کیا۔ چاچا نہ ملا۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے چاچا گھر نہیں لوٹے رشتے داروں سے پوچھا۔ عام لوگوں کو اطلاع دی لیکن سب بے سُود۔

چاچی گُم سُم رہنے لگی۔ اس کا ہنسنا کھیلنا سب ختم ہو گیا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا لا بھے اور کالے کے حالات بدلنے لگے۔ ان کے دلوں میں آگ بھڑکنے لگی۔ بدلے کی آگ۔ وہ اب گھر سے باہر رہنے لگے۔ چاچی اپنے آنسو پونچھ کر کئی باران کو سمجھانے لگی لیکن بدلے کا احساس.........

اب گھر سے باہر رہنا اور رات دیر سے گھر لوٹنا اُن کی عادت بن گئی تھی۔ گاؤں والوں کو اب پورا یقین ہو گیا کہ چاچا مارا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں روز کوئی نہ کوئی مارا جاتا ہے یا گھر واپس نہیں لوٹتا۔

کس کو کون لے جاتا ہے کہاں لے جاتا ہے کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ گاؤں والے اور پولیس والے ایک دوسرے کے ساتھ شیر اور بکری والا کھیل کھیلتے ہیں پولیس والے گاؤں والوں کے ساتھ اتنا بُرا سلوک کرتے ہیں جیسے یہ لوگ سرحد پار سے آئے ہوئے دہشت گرد ہوں وقت گذرتا گیا۔ معلوم نہیں کتنے جوان مارے گئے کتنوں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔

ایک دن صبح سویرے تھوڑی دھوپ نکلی تھی کہ گُردوارے

کے پچھواڑے گلی میں شور وغُل پڑ گیا۔ لابھے کی گولیوں سے چھلنی لاش زمین پر پڑی تھی۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ تھانے میں رپورٹ درج کرانے کے باوجود پولیس نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ صبح صبح یہ منظر دیکھ کر زمین بھی کانپنے لگی۔ انسانوں کی بات ہی نہیں۔ چاچی سینہ کوبی اور آہ وزاری کرتی رہی۔ دونوں بہوؤں نے دھاڑھیں مار مار کر اپنا اتنا بُرا حال بنایا کہ پرندے چہچہانا بھول گئے۔ چاچی دیوانہ وار لاش کے گرد گھومتی اپنا سر پیٹتی، ہاتھ ملتی، آنسوؤں کی دھار بہاتی آہ وزاری کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "لابھے کی بیوی یہ لابھا ہے" لابھے کی بیوی پتھر سے سر ٹکرانے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی "نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے یہ لابھا نہیں ہوسکتا"۔

لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہوگئی اور چاچی نے لابھے کا نام لے لے کر پاگلوں کی طرح آسمان سر پر اٹھالیا۔

بیتی باتیں

میں پلنگ پر بیٹھی کومِک پڑھ رہی ہوں۔ ممی کی آنکھوں میں بہت عرصے کے بعد آنسو دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا۔ پہلے بھی ممی کئی بار روئی تھی۔ خود ہی آنسو بہاتی اور پھر خود ہی پونچھ لیتی۔ لیکن اُس وقت میں چھوٹی تھی۔

ایک دن گھر میں بات چل رہی تھی کہ ممی کی شادی ہو رہی ہے میں نے شادی کا نام پہلی بار سنا تھا۔ بہت ہی خوش ہو کر میں نے ممی سے پوچھا "ممی، ممی ہمارے ڈیڈی آئینگے نا؟"

ممی نے یہ سُن کر ایک آہ بھری۔ اس وقت میرے ننّھے سے دل نے محسوس کیا کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی۔ ممی ہچکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ میں ہکاّ بکاّ رہ گئی۔ اور میرے بھی آنسو نکل آئے۔ ممی نے مجھے اپنی چھاتی سے لگایا۔ وہ مجھے اپنی گود میں لیکر دیر تک پیار کرتی رہتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سکول میں کلاس کے سارے بچے اپنے اپنے ڈیڈی کو یاد کر کر کے اور ان کی باتیں سُنا سُنا کر خوش ہوتے۔ لیکن ایک میں تھی کہ میری تُوتلی زبان پر ڈیڈی کا لفظ کبھی نہیں آتا تھا۔ کئی بار یونہی آنکھیں

بھر آئیں لیکن آنسو دل کی تپش سے خود بخود خشک ہو جاتے۔

جب بھی میرے ساتھ کے بچے اپنے اپنے ڈیڈی کا نام لیتے مجھے محسوس ہوتا جیسے میں ایک بنا شادی ماں کی اولاد ہوں۔ ممی نے اپنی ساری زندگی میرے بچپن اور جوانی پر نچھاور کی۔ اس نے مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میرا باپ نہیں ہے۔ اپنی پھول جیسی جوانی مجھ پر قربان کر دی۔

آج ہرپال آنٹی اور ماسُو آنٹی ہمارے گھر آئی تھیں۔ ماسو آنٹی کے پتی کو پچھلے مہینے دہشت گردوں نے مخبر سمجھ کر مار دیا تھا۔ ماسو آنٹی کو دیکھکر ممی کچھ زیادہ ہی دُکھی ہو گئی تھی۔ جیسے اس کا چھپا ہوا دکھ اور غم تازہ ہو گیا ہو۔ اس کی ہچکیوں اور آنسوؤں سے سارا ماحول غم زدہ ہو گیا تھا۔ ماسو آنٹی ابھی چھوٹی ہی تھی یہی کوئی چوبیس پچیس برس کی۔ اس کی جوانی، صحت اور خوبصورتی سے لگتا تھا جیسے ابھی کنواری ہو۔ میری ممّی آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی ”دیکھ ماسُو یہ بھی زندگی کا ایک پہلو ہے جو تجھے دیکھنا اور سہنا ہے۔ دنیا کی وہ اچھی بُری باتیں سُننی پڑیں گی۔ جن سے ڈر کر لڑکیاں دوسری شادی کرتی ہیں۔ جو عورتیں بُرے دن برداشت نہیں

کرتیں انہیں اچھے دن گذارنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ یہ سچ ہے کہ عورتوں کو ماں بننے کی چاہت ہوتی ہے۔ لیکن جس کے ایک چھوڑ دو بچے ہوں اُسے شادی کی کیا ضرورت؟ دوسری شادی کے بعد پہلے بچوں کی اچھی دیکھ ریکھ نہیں ہو پاتی ہے اور دوسرا گھر بسانے میں کئی طرح کی تکلیفیں پیش آتی ہیں۔ جن کی طرف دیکھ کر ہر روز ساس بہو میں جھگڑا۔ ساس کہتی ہے تُو اپنے بچوں سے زیادہ پیار کرتی ہے اور ہمارے بچوں کے ساتھ کم۔ حالانکہ بچے تو ایک جیسے ہوتے ہیں چاہے پہلے خاوند سے ہوں یا دوسرے خاوند سے۔ پھر ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ ماں کے دل کو کھول کر کون دیکھ سکتا ہے۔ پھر یہ بھی بات ہے کہ دوسرے گھر کے بچے ہوں تو پہلے بچوں کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھ ہرپال.........

ممی ہرپال آنٹی کی طرف مخاطب ہو کر ماسو آنٹی کو سناتی ہے۔ میرے ''اُس کو'' مرے گیارہ سال ہو گئے۔ مجھے بھی دوسری شادی کے لئے بہت مجبور کیا گیا تھا لیکن دنیا کے حالات دیکھ کر میں نے دوسری شادی کرنے کی خواہش نہیں کی۔ میں نے جنگی کی طرف دیکھ کر اکیلے زندگی گذارنے کا فیصلہ کر لیا۔ زندگی تو گذر ہی جاتی ہے۔ جب فیصلہ لے لیا

تو دوسری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے جتنا پیار ''اُس نے'' دیا وہ کون دے سکتا ہے۔

ممی ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگی ''وہ پیار بھرے شب و روز وہ تمنّاؤں اور امیدوں بھرے پَل اور لمحے کہاں گئے۔ وہ ہنسنے کھیلنے کے دن کب گذر گئے۔ کیونکہ ہمارا ہنسنا کھیلنا اپنی چار دیواری سے باہر کسی کو بھی اچھا نہیں لگنے والا''۔

ماسو آنٹی کی آنکھیں چھلک پڑیں اس نے اپنے دوپٹے کے پلو نے آنسو پونچھ لئے۔ ''ارے تو دل چھوٹا کیوں کرتی ہے۔ ذرا حوصلے سے کام لے۔ بُرے دن بھی گذر جائینگے اب اپنے بچوں کے آرام کا خیال کر۔ ہاں ایک بات بتاؤں۔ اب تیری عزت اور بچیوں کا مستقبل تیرے ہاتھوں میں ہے۔ خود محنت کر اور ہمت کی کمر باندھ''۔

ممی ماسو آنٹی کو بڑی دیر تک سمجھاتی رہی۔ میری ممی چار بھائیوں کی اکیلی بہن تھی کتنی دھوم دھام سے اس کی شادی ہوئی ہوگی لیکن مالک کو اس کی خوشی منظور نہ تھی۔ میں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے ہی کئی بار سوچا کہ ماسو آنٹی سے کہوں کہ دوسری شادی کرے۔ لوگ چار دن باتیں کریں

گے اور خود ہی بھول جائینگے۔ لیکن دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ ماسو آنٹی کے باپ نے بڑی کوشش کر کے اسے بنک میں پتی کی جگہ نوکری دلوادی۔ اُسے معلوم تھا کہ چھوٹی ہے اور آگے کی زندگی بہت لمبی ہے بچوں کی پرورش بھی کرنی ہے اس کے علاوہ باپ بھی ماسو کی دوسری شادی نہیں چاہتا تھا۔

بہت دن گذر گئے لیکن اِدھر اُدھر کی باتیں سُن سُن کر ماسو تنگ آ گئی۔ اُسے اپنا میکہ بھی غیر سا لگنے لگا۔

بھابھیوں نے لوگوں کی باتیں سن کر گھر میں کئی بار بات چھیڑنا شروع کی۔ وہ کہتی رہیں کہ بہتر ہے ماسو اپنی عزت کی خاطر شادی کرے لوگوں کے منہ خود ہی بند ہو جائیں گے۔ بڑی بھابی کہتی "ابھی چھوٹی ہے کتنی دیر اس بیوگی کو جھیلتی رہے گی۔ چلو لوگ باتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آہستہ آہستہ خود ہی خاموش ہو جائیں گے۔ چھوٹی عمر ہے پہاڑ جیسا مستقبل آخر نوکری کے ساتھ ہی نہیں گذر سکتا میری مانو تو کوئی اچھا سا جوان لڑکا دیکھ کر شادی کر ہی لو۔"

آہستہ آہستہ ماسو آنٹی کا ہمارے گھر آنا جانا کم ہو گیا۔ اب وہ

کبھی کبھار ہی بازار آتے جاتے مل جاتی۔ وہ اب بھی کنواری لگ رہی تھی اچانک اس کا ہنسنا کھیلنا جیسے واپس لوٹ آیا ہو۔

میرا دل اب اس کے ساتھ ملنا جُلنا چاہتا تھا۔ اور میں کبھی کبھی اس کے گھر بھی جاتی تھی۔ مگر وہ ہمارے گھر کبھی کبھار ہی آتی۔ اگر آتی بھی تو کھڑے کھڑے واپس چلی جاتی۔ ایک دفعہ شام کے وقت ہم گھر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے ہم ماں بیٹی آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ ہم نے دُور سے ماسو آنٹی کے بڑے بھائی صاحب کو آتے دیکھا۔ ممی نے خود ہی جا کر گیلری کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے ''مہربانی کر کے شادی میں ضرور آئیو''۔

وہ چلے گئے۔ ممی جلدی جلدی دعوتی کارڈ پڑھنے لگی۔ اور بے سُدھ ہو کر صوفے پر جیسے گر پڑی۔

ماسو آنٹی کی شادی کا پیغام پڑھ کر ہکّا بکّا رہ گئی۔ اور لمحہ بھر میں اپنے ماضی کی پرچھائیوں میں کھو گئی۔

ہنستے چہرے

میں سردی سے بچتا بچاتا لوگوں کو دائیں بائیں ہٹاتا شالی کلرک کی کرسی پر جا بیٹھا۔ اور اپنی درخواست ڈھونڈنے لگا۔ آج لوگوں کی بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ کافی کوشش کے بعد بھی جب درخواست نہ ملی تو میں شالی کلرک کو ڈھونڈنے لگا۔ میرے دائیں طرف ایک عورت میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میری نظر اس پر پڑی۔ سرخ رنگ کا شال اور کرتا پائجامہ زیب تن کئے دقبول صورت، اوسط قد کاٹھ والی اس عورت کے چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ ماتھے پر موٹے آکار کا سُرخ ٹیکہ، ناک میں سرخ رنگ کے نگ والا جُھمکا چمک رہا تھا۔ سخت سردی کی وجہ سے اس کا نرم ونازک بدن جیسے سکڑ گیا تھا۔ اس کا گندمی رنگ کچھ کچھ سُرخی مائل کالا سا دِکھ رہا تھا۔ اُسے اس حالت میں کھڑا دیکھ کر میں نے پوچھا ''تم کس کام سے آئی ہو؟'' منہ سے کچھ بولے بغیر اس نے میرے سامنے ایک درخواست رکھدی۔ میری نظر درخواست کے آخری جملوں پر پڑی۔ لکھا تھا ''سیتا رانی زوجہ آنجہانی ....'' مجھے اس کی بے بسی پر رحم آیا۔ اور میں بڑے غور سے اس کے پورے جسم کا جائزہ لینے لگا اتنی

چھوٹی عمر میں بیوہ اور یہ جوانی ''نہیں نہیں'' میں دل ہی دل میں کہنے لگا۔ میں باہر نکلا وہ میرے پیچھے پیچھے نکلی۔ ہم دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ میں اس سے بات کرنے کیلئے کچھ بیتاب سا تھا۔ اتنے میں اس نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا ''شالی کلرک کہاں ہیں''؟ ''بس ابھی آئے گا'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہارا مرد کہاں ہے''؟ ''وہ...وہ'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ درخواست کا آخری جملہ میرے دماغ میں کانٹے کی طرح چُبھ رہا تھا۔ میں نے پھر پوچھا ''یہ سیتا رانی تمہاری کیا لگتی ہے''؟۔ وہ لمحہ بھر کیلئے پھر خاموش رہی اور جوتے کی نوک سے زمین کھرُچنے لگی۔ اس نے جواب میں کہا ''میں ہی سیتا رانی ہوں''۔

''شالی کلرک آج نہیں آئے گا'' کسی کی اس آواز نے میری سوچ کا تانا بانا توڑ دیا۔ چار پانچ دن وہ نظر نہیں آئی۔ میری نظریں برابر اُسے ڈھونڈتی رہیں۔ مگر نہ اس کی درخواست نظر آئی نہ اُسے دیکھا۔ نہ معلوم اس کے ساتھ کوئی رشتہ ناطہ نہ ہوتے ہوئے بھی میں اس کے بارے میں کیوں سوچتا رہا۔ حالانکہ اس میں اتنی کشش بھی نہیں تھی کہ کسی کا دل موہ لے۔ البتہ اس کی معنی خیز خاموشی میں کوئی اثر تھا۔

چند دن بعد میں نے اُسے تحصیلدار کے دفتر کے باہر دیکھا مجھے دیکھتے ہی وہ ذرا سا مسکرائی اس کی یہ کھوکھلی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ اور مجھے کسی انجانے شک نے گھیر لیا بڑی دیر تک میں کئی اچھے بُرے خیالات کے سمند میں ہچکولے کھانے لگا۔ شام کو میں بازار سے سبزی خرید رہا تھا کہ وہ بھی اچانک وہاں آنکلی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھر اسی ادا سے مسکرائی۔ مجھے اس کی ہر ادا اور مسکراہٹ کھوکھلی، بناوٹی اور خالی خولی لگتی تھی۔ اب میرا دل اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے قریب ٹھہرا۔ اس نے یونہی اپنی درخواست کے بارے میں پوچھا ''ابھی کچھ نہیں'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا میری درخواست .....'' ''وہ تو راشن کارڈ دوسرے ہی دن تیار ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارا کیس سٹرانگ تھا''۔ میں نے اس کی درخواست کی تائید کرتے ہوئے کہا ''وہ کیسے''؟ ''بیوہ ہونے کی وجہ سے'' میں نے بڑی پس وپیش سے جواب دیا۔ مجھے اس کی اداؤں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ایک تو بیوہ پھر یہ بے وجہ اور بے مقصد مسکراہٹ۔

اس کی جوانی پر ترس آتا تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں اتنا بڑا صدمہ۔ آخر یہ زندگی کس طرح گذارے گی۔ میں بہت دُکھی ہو گیا۔ اور اس کے لمبے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے میرا دھیان اپنی طرف کرنے کے لئے پھر سوال کیا ''سیتل جی۔ کیا سوچ رہے ہیں آپ''؟

میں نے حیران ہو کر پوچھا ''آپ مجھے پہلے بھی جانتی ہیں کیا؟''

''نہیں تو۔ مجھے آپ کی درخواست سے پڑھ کر معلوم ہوا۔ میں ٹیچر ہوں اور میرے پتی بھی ٹیچر ہیں ہم سرحدی علاقے کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے دو بچے بھی ہیں۔''

''جی؟ تو وہ درخواست؟'' میرا مُنہ کھلا کا کُھلا رہ گیا اور میں جلدی جلدی پوچھنے لگا۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''جی۔ یہ سب کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایسا نہ کرتی تو راشن کارڈ کیسے مل جاتا''۔

یہ سُن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکلنے لگی۔ میں غصے اور نفرت سے لال پیلا ہو گیا۔ جی چاہتا تھا اِسے کہوں ''یہ تو نے ٹھیک نہیں

کیا۔ تو نے اپنے ضمیر کو دھوکا دیا۔ تیرے اس راشن کارڈ سے کسی غریب کنبے کا گذارہ ہوتا۔ جا، یہ راشن کارڈ واپس کر کے دوسروں کے لئے مثال قائم کر"۔

"لے لو۔ لے لو۔ سستا مال پانچ روپے کلو"۔ اس شور و غُل میں میری آواز دب گئی۔ سیتا رانی جا چکی تھی۔ لیکن اس کی پھیکی پھیکی، کھوکھلی مسکراہٹ اور آواز میرے کانوں میں ابھی تک ہتھوڑے مار رہی تھی۔

احساس

"جناب ذرا تھوڑا سا آگے چلیں" اس نے بھری بس میں چڑھتے ہوئے سواریوں سے کہا۔ لیکن کوئی سواری ایک بھی قدم اِدھر اِدھر ہلنے کو تیار نہ تھی۔

وہ بس کے دروازے پر کھڑا اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ اُسے بس سے گرنے کا خیال بُری طرح خوف زدہ کر رہا تھا۔ کنڈکٹر نے بھی سواریوں کو کئی بار آگے پیچھے ہونے کو کہا۔ لیکن سواریوں نے سُنی ان سُنی کر دی۔

وہ اِدھر اُدھر کر کے کسی طرح آگے چلا گیا۔ کچھ سواریاں اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہیں تھیں۔ ایک جوان نے راستہ دیتے ہوئے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا "بھائی ذرا سردار جی کو آگے جانے دو"۔

اس نے بھی موقع غنیمت جانتے ہوئے آگے جانے کی کوشش کی۔ اتنے میں اس کی نظر سیٹ پر بیٹھی ایک عورت پر پڑی۔ اور اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسی شہد کی وجہ سے یہ مکھیاں آگے پیچھے بھنبھنا رہی ہیں۔

وہ کالے رنگ کا فراک اور سفید پائجامہ پہنے تھی۔ اس کا بدن صاف شفاف چمکتے چاند کی طرح چمچمار ہا تھا۔ کالے رنگ کا دوپٹہ بائیں کندھے سے نیچے کی طرف سرکنے کی وجہ سے اس کی چھاتیوں کی ہلچل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ پستانیں دودھ کی ادبھری مٹکی کی طرح چھلک رہی تھیں۔ اس کی اپنی نظریں بھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں لگتا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر اپنے انگ انگ کی نمائش کر رہی ہو۔

گود میں سوَرگ کی نیند سویا ادکھلے گلاب سا بچہ مسکرار ہا تھا۔ اسکے نرم و نازک ہونٹ جیسے کچھ کہنے کے لئے پھڑ پھڑا رہے ہوں۔ اور وہ نیند میں ہی جیسے سواریوں کی حرکات تاڑ رہا ہو۔

لڑکی گود میں سوئے ہوئے بچے کی طرف نظریں ٹِکائے من ہی من میں صدقے جاتی۔ اُدھر اس وقت بھی اس شہد کے چھتے کو چاٹنے کیلئے سواریاں بیقرار تھیں۔

اتنے میں بچے کی آنکھ کھُلی اور وہ دودھ پینے کے لئے بیتاب تھا۔ اور رونے تڑپنے لگا۔ لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ خود بھی بچے کو دودھ پلانے کیلئے بے چین تھی۔ بچے کو بہلانے پھُلانے کے بڑے جتن

کئے لیکن اُسے بھوک لگی تھی وہ ایک نہ مانا۔ عورت کے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ سواریوں کا بس چلتا تو وہ بچے کو باہر پھینک دیتے۔ لڑکی کو خود بھی محسوس ہورہا تھا کہ اس نے ایسے مہین کپڑے پہن کر بہت غلطی کی تھی بچہ رورو کر ہلکان ہوگیا۔ ایک بزرگ سواری سے بچے کا تڑپنا برداشت نہ ہوسکا "بی۔ بی۔ جی بچے کو دودھ تو پلاو۔ اس میں اس کا کیا قصور ہے۔"

عورت کی ممتا جاگ اٹھی اور فوراً دودھ بھری پستان بچے کے منہ میں ڈالدی ماں کا یہ روپ دیکھ کر ساری سواریوں میں اپنے وجود کا احساس جاگ اٹھا اور وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے منہ لٹکا کر رہ گئے۔

بھروسہ

آخر مجھے ایک سیٹ مل ہی گئی۔ اگر میں کچھ ہی منٹ لیٹ ہو جاتی تو دو گھنٹے کا پورا سفر کھڑے کھڑے ہی طے کرنا پڑتا۔ جو میرے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ بارہ مولہ بس اسٹینڈ سے اوڑی کے لئے کئی بسیں جانے والی تھیں لیکن مجھے وقت پر ڈیوٹی پہنچنا تھا۔ اس لئے میں ہمیشہ پہلی بس پکڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔ سیٹ پر بیٹھ کر تھوڑا سا اطمینان ہو گیا۔ ساڑھی کے پلّو سے پسینہ پونچھتے ہوئے میں نے اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں بیٹھی سواریوں کی طرف ایک سرسری نظر دوڑائی ہو سکتا ہے کوئی جانی پہچانی سواری کہیں بیٹھی ہو۔

بس میں زیادہ تر ریاست سے باہر کے مزدوروں کی بھیڑ نظر آئی۔ میری ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ اور میں اپنی کسی من پسند سواری کے انتظار میں تھی۔ بس روانہ ہونے میں اب یہی کوئی دو تین منٹ کا وقت تھا۔ میں اسی سوچ میں تھی کہ ایک بھاری بھرکم آدمی کیسری دھوتی باندھے سامنے کھڑا ہوا۔ لمحہ بھر میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ مجھے لگا کہ وہ کسی عجیب پریشانی میں ہے۔ کیونکہ اس کے چہرے

سے غم اور غصے کے آثار نمایاں تھے۔ قد کوئی چھ فٹ، ترشی ہوئی داڑھی جس کے بال کہیں کہیں سفید ہو گئے تھے۔ عمر کوئی چالیس پنتالیس، شکل وصورت سے پنجابی لگ رہا تھا لیکن رنگ کسی قدر گورا ہونے کی وجہ سے اس کے کشمیری ہونے کا دھوکا بھی ہو جاتا۔

''ساتھ والی سیٹ خالی ہے کیا مجھے بیٹھنے کی اجازت ہے''؟ وہ کچھ کچھ گھمبیر آواز اور پیار کے انداز میں کہنے لگا۔ ''جی'' میں بس اتنا ہی کہہ کر تھوڑا ایک طرف کو سرک گئی اور وہ سیٹ پر آ بیٹھا۔

بازار کے بھیڑ بھاڑ والے ایریا سے باہر نکلتے ہی بس نے رفتار پکڑی۔ سڑک کی حالت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے بس ہچکولے کھا رہی تھی۔ اور میں اس آدمی کے موٹاپے کی وجہ سے دُبک جاتی۔ لیکن اس کے جسم کی سوندھی سوندھی قُربت سے ایک طرح کی لذّت محسوس ہو رہی تھی۔ میں چور نظروں سے اُسے دیکھتی جیسے وہ جان بوجھ کر مجھے چھیڑ رہا ہو۔ لیکن مجھے اس کی کوئی حرکت ایسی نہیں لگی وہ بڑے سکون سے اپنی سیٹ پر بیٹھا باہر دیکھتا اور دور تک پھیلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ اس دوران وہ بیچ بیچ میں میری طرف بھی دیکھتا۔

اچانک بس کو ایک زوردار جھٹکا لگا ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور دونوں کی نظریں ایک دوسرے کی طرف اٹھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی نیت سمجھنے کی کوشش کرتی میں نے اپنی عادت کے مطابق دوسری طرف دیکھا۔ مگر وہ بار بار میری طرف دیکھتا۔ میں سوچتی وہ کونسا جذبہ ہے جو مجھے بار بار اس کی طرف دیکھنے کیلئے مجبور کر رہا ہے اور یہ کونسا بوجھ ہے جس سے میری نظریں جُھک جاتی ہے۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ یقین ہوگیا کہ اس آدمی کی نیت خراب نہیں ہے۔ پھر بھی کچھ ڈر سا لگ رہا تھا اور تھوڑا شرما رہی تھی۔

بس کو ایک اور جھٹکا لگا۔ اور میں انجانے میں اچانک اس کے کندھوں کے ساتھ لگ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس دوران اس نے پھر میری طرف ایک دوبار دیکھا۔ اس کی رعب دار اور پُر وقار آواز کانوں کے پردوں سے پھر ٹکرائی۔ "آپ کہاں جارہی ہیں"؟ "مجھے اوڑی جانا ہے کیا آپ بھی اوڑی جارہے ہیں؟" اس نے کہا "جی" اور پھر بولتا رہا "میں پنجاب سے آیا ہوں"۔ "اوڑی میں آپ کا کوئی اپنا ہے؟" میں نے حوصلہ کر کے پوچھا اس نے ایک لمبی آہ بھری اور کچھ اُداس ہوکر کہنے

لگا"۔ میری ایک بچی تھی پنکی۔ بالکل تم جیسی۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہے ایک دن ایک اجنبی پھرتا پھراتا میرے گھر آیا ہم نے ترس کھا کر اسے اپنے ہاں نوکر رکھ لیا۔ وہ میرے ہاں چار پانچ سال رہا۔ لیکن اندر اندر سے وہ پنکی کو اپنے جھوٹے پیار کے جال میں پھنسا کر ایک دن گھر سے بھگا کر لے گیا۔ اب ایک سال گذر گیا۔ ہم نے سُنا کہ اس کمینے نے میری پنکی کو مار ڈالا ہے۔ نقدی اور زیور چھین کر خود کشمیر بھاگ آیا ہے۔ میں اسی کو ڈھونڈنے یہاں آیا ہوں۔ میری زندگی کا مقصد ختم ہو چکا ہے۔ اب میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے اس قاتل کا "خون" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو بہہ رہے تھے۔

"اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ زندگی برباد ہو چکی ہے۔ پنکی زندہ ہوتی تو زندگی آرام سے گذرتی۔ مگر اب زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ بے مقصد اور فضول۔ زمین جائداد کا کوئی والی وارث بھی نہیں۔ ہاں میرا کوئی نہیں۔ آ۔ مجھے اپنی پنکی کا پیار دے۔ ہاں میری بیٹی پنکی میری اولاد بن کر"۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک سایہ دار چنار کی گھنی ٹھنڈی چھاوں میں بیٹھی ہوں۔

دہکتے چُولھے

''بابو جی اس بچی کے لئے پانچ دس پیسے دیدیں۔ صبح سے بھوکی ہے کچھ نہیں کھایا ہے۔ آپ کے بچے جیتے رہیں۔ دیدیں نا کچھ'' بچی اپنے ننھے منے ہاتھ پھیلاتے ہوئے ہتھیلی پر رکھے پیسوں کو چھنچھناتے ہوئے کبھی میری طرف اور کبھی گاڑی میں بیٹھی سواریوں کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ سوچے بغیر میں نے پچاس پیسے بچی کی ہتھیلی پر رکھے۔ میری دیکھا دیکھی اکثر سواریوں نے دس پیسے بیس پیسے دیئے۔ اور یہ عورت دُعائیں دیتے ہوئے بس سے اُتر گئی۔ وہ ایک بس سے اترتی دوسری بس میں چڑھتی پیسے بٹورتی اڈے میں بسوں کی بھیڑ میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

دوسرے دن ہم نزدیکی لِنک روڑ کی طرف جاتے ہوئے بس اڈے میں پہنچے۔ وہ پہلے ہی اوڑی جانے والی بس میں بچی کو لئے اپنے کام میں مصروف تھی۔ ہر ایک سواری کے پاس جا کر پانچ دس پیسے لیکر آگے بڑھتی۔ اور شام تک بھیک مانگتی پھر نہ جانے کہاں جاتی۔ کس طرف جاتی؟ میرے اندر یہ سوال پیدا ہوا۔ اس کا ٹھور ٹھکانہ کہاں ہے

اور اس کا مرد......؟ میرے دل میں ایسے ہی کئی خیالات اور شک پیدا ہوئے یہ اتنی زبانیں کیسے بول سکتی ہے؟

آج نیتو بھی میری ہی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ صبح کے دس ہو گئے۔ رات تھوڑی بارش ہونے کی وجہ سے ماحول کچھ ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ کل کے ہی وقت پر وہ بس پر چڑھ آئی۔ بس میں چڑھتے ہی خود انجن کے ساتھ کھڑی ہوئی اور بچی کو سامنے کھڑا کیا۔ آج اس کے بھیک مانگنے کا ڈھنگ اور ہی تھا۔ اس سے پہلے میں نے اُسے گانا گا کر مانگتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اب لوگ پیسے دے دے کر تنگ آ چکے ہیں۔ وہ انجن کے سامنے کچھ فلمی گیتوں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے گاتی اور بچی ہر ایک سواری کے سامنے ہاتھ پھیلائے جاتی اس طرح وہ ہمارے پاس بھی پہنچی۔

وہ بچی کو آگے رکھ کر درد بھرے انداز میں کہنے لگی "بابو جی آپ کی جوڑی سلامت رہے آپ کے بچے جئیں"۔

ہم پیار بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ نیتو میری طرف کچھ تیکھی نظروں سے دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی۔ اس نے

پرس سے ایک روپے کا نوٹ نکا کر بچی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ ہم اس کی پنجابی بولی سُن کر محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی دوسری سواریوں کے پاس گئی۔ اس کے ان الفاظ ''بابو جی جوڑی جیوندی رہے'' (بابو جی جوڑی سلامت رہے) کے ساتھ ہم اپنے حال اور مستقبل کے خیالوں کو جوڑتے رہے۔ ہم پیار کی گہری سوچ میں غوطہ زن تھے کہ کسی کی آواز کانوں سے ٹکرائی ''او، لڑکی کل تک تُو ہندی بولتی تھی آج تمہاری بولی پنجابی کیسے ہوئی؟''

وہ بس سے اُتری لیکن اپنے پیچھے ایک سوال چھوڑ گئی۔ اور سواریاں اس سوال پر کچھ نہ کچھ بولتی رہیں۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ایک سواری نے گفتگو کا موضوع یہ کہہ کر بدل دیا ''ماں کسی کی ذاتی جاگیر نہیں ہوتی'' دوسری سیٹ سے ایک بزرگ نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا ''یہ پنجابی بولتے ہوئے ہندی کیسے بولنے لگتی ہے اور ہندی بولتے ہوئے پنجابی؟''۔

بس میں کُھسر پُھسر اور اونچی نیچی آوازوں سے ماحول کچھ گرما گیا۔ اتنے میں ایک اور آواز آئی ''ارے تم لوگ ماں کو کیوں کوستے

ہو؟ ماؤں کو نہ بانٹو۔ ان کے دودھ میں زہر نہیں امرت ہوتا ہے''۔ یہ بات سُن کر سب ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے اور خاموشی چھا گئی۔

اگلے روز چھٹی تھی۔ وہ بازار جاتے ہوئے بچی کو ساتھ لئے میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ آج بچی نے پیسے کے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا بلکہ اپنے مہندی لگے ہاتھ مجھے دکھانے لگی۔

پرانے دھوئے ہوئے کپڑوں کے اندر اس نے اپنی ڈھلتی جوانی کے نہ معلوم کتنے درد چھپا رکھے تھے۔ کتنی خواہشوں اور ارمانوں کا گلا گھونٹا تھا۔ میرے دائیں بائیں کتنے لوگ چلتے رہے مجھے کوئی خیال بھی نہ رہا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور میں نے سہم کر ادھر اُدھر دیکھا۔

''تیرا نام کیا ہے؟'' میں نے تھوڑی ہمت کر کے پوچھا وہ کچھ کچھ شرمائی میں نے اور کوئی سوال کئے بغیر اس کے ہاتھ میں پچاس پیسے رکھ دیئے۔ وہ جانے لگی تو میں نے پھر پوچھا ''تیرا نام؟'' پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے شرم سے اس کا گندمی رنگ کھل سا اٹھا۔

''کُندن'' اس نے آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا۔

اس کے شرمیلے چہرے سے......کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے

اپنا نام بتایا لیکن نہ جانے کن سوچوں میں ڈوب گئی۔

ان بھکارنوں کا نام بھی کیا کُندن ہو سکتا ہے؟ نہیں نہیں شاید وہ جھوٹ بول رہی ہے نہیں، یہ سوچنا بھی غلط ہے۔ آخر انہیں بھی جینے کا حق ہے ان کے بھی اپنے سماج میں حقوق ہیں۔ لیکن کیا ان کو اس طرح کی زندگی اچھی لگتی ہے؟ کیا ان کے دل میں لاج اور شرم نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟ گلی گلی سڑک سڑک بھیک مانگنے سے کیا ان کو شرم نہیں آتی؟

"کیا تُو سچ کہتی ہے"؟ وہ مسکرانے لگی۔ "اچھا تو کیا تم لوگ سچ مچ پنجابی بولتے ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو"؟ یہ سن کر وہ ذرا چُپ ہوگئی۔ اس کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کوئی جواب دیئے بغیر چلی گئی۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ یہ سچ ہے کہ ان لوگوں کا گھر ٹھکانہ کہیں نہیں لیکن ہر جگہ اور ہر مقام پر ہے جہاں بیٹھے وہیں گھر۔ ہر گلی کوچے میں پھرتی پھراتی نہ معلوم کہاں اور کدھر چلی گئی۔ میری نظریں دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں پانچ دس پیسے کے لئے کتنی زبانیں بولتی ہے۔ کتنوں کا دل موہ لیتی ہے۔ کتنوں کی نفرت کا نشانہ بنتی ہے کتنا اور... کیا

پچھ.....؟ اتنی بولیاں بولنے والی ماں کے بچے کونسی بولی بولیں گے یا وہ کسی نئی زبان کی ابتداء کریں گے۔ ان کا مذہب کیا ہوگا۔ یہ بھکاری بس انسان ہیں نہ بھید بھاو نہ فرق تفریق۔ بیساکھی بھی مناتے ہیں اور کرسمس بھی عید بھی مناتے ہیں اور شوراتری بھی۔ سبھی تہوار بڑے جوش اور چاو سے مناتے ہیں۔ یہی بھکاری شاید نئی دنیا کا سُدھار کریں گے۔ اور بغیر کسی تعصب کے نئی زبان نیا سماج وجود میں آئیگا۔ اگلے دن وہ پھر اس بس اڈے میں نظر آئی۔ آج نیتو میرے بائیں طرف نہیں بیٹھی تھی۔ وہ مجھ سے دُور بہت دُور چلی گئی تھی۔ اُسے اب میرے بائیں طرف نہیں بیٹھنا تھا۔ وہ اپنی دنیا بسا کر کسی کے ساتھ اپنے گھریلو جھنجھٹ میں مصروف ہوگئی تھی۔۔ لیکن اس کی یادیں اب بھی اس بس میں گھوم رہی ہیں۔

وہ بس میں اپنی بچی کو ساتھ لئے گیتوں کے وہی ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے اپنی بے سُری آواز میں گا گا کر پیسے جمع کرتے ہوئے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی بالکل انجان اور اجنبی سی۔ جیسے کبھی ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ ہو۔ ویسے بھی میرا اس کے ساتھ کوئی جذباتی یا خونی رشتہ نہ تھا۔ اس کا وہی مایوسی بھرا جُھلسا ہوا چہرہ اور آنکھوں کے کناروں میں چُھپے

آنسو۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کے اندر ہی اندر پکتے ہوئے دُکھوں اور دم توڑتے ارمانوں کے زخم موجود ہیں۔

ایک روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھا وہ چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اُسے اس اڈے میں کبھی نہیں دیکھا۔ نہ معلوم میرا اس کے ساتھ کونسا رشتہ تھا کہ میرے اندر اس کی کمی سی محسوس ہونے لگی۔

آج میں کوئی دس سال بعد ایک دفعہ پنجاب کے گُرواروں کی یاترا کے لئے جارہا ہوں آج کُندن میرے ساتھ بیٹھی ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم آس پاس کا نظارہ دیکھ رہی ہے۔ ہماری بس پٹھانکوٹ کے بس اڈے میں رُکی۔ میری نظریں اس کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ کیونکہ ایک دفعہ اس نے مجھے اسی جگہ کا پتہ بتایا تھا لیکن اب تو دس سال ہو گئے نہ معلوم اب.......

پھر بھی میں اُسے دیکھنے کیلئے بیقرار ہوں۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہیں نظر نہیں آئی۔ سواریاں ہوٹلوں میں دوپہر کا کھانا کھا رہی تھیں ہم بھی روٹی کھانے کیلئے ایک ڈھابے میں بیٹھ گئے۔

دُور ایک دکان کے سامنے کھڑی کسی عورت کا سایہ سا دکھائی دیا۔ میں لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا وہاں پہنچا مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی آسانی

سے مل سکے گی۔ وہ حیران ہوکر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ جیسے کوئی سپنا دیکھ رہی ہو۔ ''بابو جی؟'' ''ہاں ہاں کُندن میں ہی ہوں۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ ہم دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نہ معلوم ہم نے ماضی کی کتنی یادوں کو تازہ کیا۔ اور مستقبل کے لئے کیا سوچتے رہے۔ پھر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کیا پوچھتے رہے۔ میں نے اُسے دیکھنے کے لئے اپنی گردن ذرا اوپر اٹھائی۔ بس اس کے وہی ڈھلکتے آنسو، بجھی بجھی سی امیدیں، خاموش اور بے زبان تمنائیں۔ میں اپنی عادت کے مطابق اُسے ایک روپیہ دینے لگا۔ لیکن اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس کی صورت بدل گئی۔ دیکھا تو اس کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔ ہاتھوں کی کھال ڈھیلی پڑ چکی ہے اور لباس بے ڈول لگ رہا ہے۔ میں اسے اُس ڈھابے پر لے گیا جہاں میری بیوی بیٹھی تھی۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا ''اس کا نام کُندن ہے'' اس نے مریل سے الفاظ میں کہا ''بابو جی۔ جوڑی سلامت رہے''۔ میں نے اس کی اُداسی کو تاڑتے ہوئے پوچھا ''کُندن تمہاری بچی تو اب بڑی ہوگئی ہوگی۔ وہ کہاں ہے؟'' ''جی اُس کی شادی ہوگئی''۔ پھر میں نے جلدی جلدی کہا ''اچھا تو تیرا گھر کہاں ہے؟''

اس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے ایسا سوال نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ گذرے ہوئے واقعات یاد آ کر اس سوال پر وہ دُکھی ہو گی۔ اور اس کے انجانے ارمانوں نے دوبارہ تازہ کروٹ لی۔

"آیئے آپ کو اپنا گھر اور گاؤں دکھاؤں"۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہمیں ایک اوبڑ کھابڑ سڑک کے کنارے لے گئی۔ ہماری بس جا چکی تھی۔ اس کی نظریں سڑک کے کنارے لگے ہوئے ٹوٹے پھوٹے خیموں کی طرف تھیں۔ جن میں میلے کچیلے روتے چیختے اور کچھ کچھ ہنستے کھیلتے چیتھڑوں میں لپٹے بچے اور بوڑھے تھے۔

دائیں بائیں سڑانڈ، بدبو، گھٹن، درد اور آس لگائے دن گذارتے بوڑھے بچے مائیں، بہنیں اور جوان لڑکیاں خاموش سوال کر رہی ہیں؟ کُندن میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ یہ مایوسی اور آنسو بھری آنکھیں دیکھ کر مجھے اپنا سوال پوچھنے پر افسوس ہو رہا ہے۔ اور کتنے ہی اَن پوچھے سوال اس کی آنکھوں سے گھر کا پتہ پوچھتے ہیں۔

بچارا کبوتر

میٹا ڈور بازار سے ہوتے ہوئے ٹاون ایریا پار کرتی ہوئی قصبے سے نکل چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف لگے سفیدے لگ رہا تھا جیسے چاک و چوبند سپاہی کسی جنرل کے استقبال کیلئے تیار کھڑے ہوں۔ تھوڑی دور لوگوں کی بھیڑ دیکھکر میٹا ڈور اچانک رُک گئی۔ سڑک کے بیچوں بیچ بچے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے بھاگتے چھینا جھپٹی میں لگے تھے۔ بچوں کے اس جھگڑے کا تماشہ دیکھنے کیلئے میٹا ڈور کی سواریاں بھی وہاں جمع ہوگئیں۔ اور کچھ سواریاں بیچ بچاو بھی کرنے لگیں۔

بچے ایک کبوتر کے لئے لڑ رہے تھے۔ جو اُڑتے اُڑتے کھیلنے والے بچوں کے بیچ گر گیا تھا اور ایک چھوٹے سے بچے نے اُسے پکڑا تھا۔

بچارا کبوتر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ مگر بچے کی پکڑ سے نہ نکل سکا۔ سارے بچے اس کے گرد جمع ہوکر کوئی کہتا پہلے میں نے پکڑا کوئی کہتا میں نے۔

کبوتر والا چھوٹا بچہ زور زور سے چیختا چلّاتا باقی بچوں کو دیکھتا

اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگا۔ لیکن آدھے راستے میں بچوں نے اسے پھر پکڑ لیا۔

ذرا اچھی عمر کے ایک بچے نے اسے بازو سے پکڑ کر کبوتر چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن وہ زور زور سے چیخنے چلّاتے لگا۔ آس پاس کی عورتیں گھروں سے نکل آئیں اور ان کی آپسمیں تُو تُو میں میں کے بعد سخت جھگڑا ہو گیا۔ سڑک کے آس پاس رہنے والے سبھی مرد عورتیں جمع ہو کر بُری طرح ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے۔ کبوتر والا بچہ ابھی بھی زور زور سے چیخ رہا تھا اور کبوتر اس کے ہاتھ میں بُری طرح اوب رہا تھا، لوگ طرح طرح کی اناپ شناپ بکنے اور گالی گلوچ کرتے ہوئے۔ لاٹھیوں چھڑیوں سے لیکر کلہاڑیوں کے استعمال تک پہنچ گئے۔ اسی اثنا میں دوسرے کنارے کے لوگوں میں ایک کہرام پڑا۔ اس بھیڑ میں سے آہ وزاری کی آواز آرہی تھی ''ہائے ماں ماری گئی''۔

اندھی پریت

''بی بی جی۔ رب تیرا بھلا کرے۔ بچی پر رحم کھاؤ''۔ اس نے میری طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ میں نے میگزین سے نظریں اوپر اٹھائیں۔ اُسے دیکھ کر میرے دل میں کچھ نفرت سی پیدا ہوئی۔ میں نے سُنا تھا کہ ایسی جوان عورتوں نے بھیک مانگنا اپنا پیشہ بنایا ہے۔ ان کے مرد مزدوری کرنے یا بھیک مانگنے کسی اور جگہ چلے جاتے ہیں اور یہ روزانہ کم سے کم پچاس ساٹھ روپے تک کماتی ہیں۔ میں نے اپنی تنخواہ کا حساب لگایا۔ اٹھارہ سو روپے مہینہ۔ اور روز کے وہی ساٹھ روپے۔ مجھ سے تو یہی اچھی ہے۔ نہ بھاگ دوڑ نہ وقت کی پابندی نہ کسی کی ماتحتی اور نہ کوئی ڈر۔ ہمارا تو بس سوٹ بوٹ اور لباس ہی لباس ہے۔

''بی بی جی'' اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ریز گاری کو چھنچھناتے ہوئے پھر کہا۔ پیسوں کی چھن چھن سے میں جھنجھلا اٹھی۔ اور میں نے سر ہلا کر اُسے معاف کرنے کو کہا۔ وہ سمجھداری کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اسے جاتے دیکھ کر میں نے کن انکھیوں سے اس کی شکل وصورت کا جائزہ لیا۔ اور مجھے وہ بہت ہی بھلی اور قبول صورت نظر آئی۔ اگرچہ زمانے کے

بوجھ تلے وہ کچھ ڈھیلی بھی پڑ گئی تھی۔ حسین تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس کا گندمی رنگ چہرے پر کالا سیاہ تِل اور بھرپور جوانی اپنی طرف دھیان ضرور کھینچتی تھی۔ اس نے بچی کو اس طرح بغل میں دبایا تھا سمجھو بچی نہو بلکہ کپڑوں کی پوٹلی ہو۔ میں نے بس کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ سڑک پر تیز تیز قدموں سے جارہی تھی۔ میں میگزین میں چھپی ایک رومانی غزل پڑھنے لگی۔

نگاہ میری کسی شباب پر پڑی جب بھی
میرے خیالوں میں بار بار تو ہی آتا ہے
تیرے بھلانے کا جب بھی جتن کیا میں نے
تو پیار میں اپنے تڑپنے کا پھر خیال آتا ہے

ان جملوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میرے اندر پریت سے ملنے کا شوق اور بھی بڑھ گیا۔ بس میں بیٹھے بیٹھے میں پرپت کے خیالوں میں کھوگئی۔ میری آنکھوں میں اس کا بھولا بھالا چہرہ گھومنے لگا۔ یوں تو میں سمی سے ملنے جارہی تھی۔ لیکن اصل میں میری نظریں سمی کے بھائی پریت کو تلاش کررہی تھیں۔ میں نے باہر سڑک پر دیکھا وہی بھکارن

واپسی مُڑ رہی تھی میں نے اشارے سے اُسے بُلایا۔ اس کے قدموں میں پھرتی آئی۔ اور پلک جھپکنے ہی بس میں چڑھ آئی۔ میں نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا "میرے پاس باقی پیسے نہیں ہیں" اسنے کہا۔ "کوئی بات نہیں سب رکھ لو" اس کی مایوس آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ جیسے اُسے یقین نہ آرہا ہو۔

"تیرا پتی کہاں ہے۔ تو بھیک مانگنے کے بدلے کوئی اور کام کیوں نہیں کرتی۔ کیوں اپنی جوانی اِن سڑکوں پر ضائع کرتی ہے؟" نہ معلوم میں نے اور کیا کیا کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ٹکٹکی لگائے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس نے سر سے پاؤں تک مجھ پر نظر دوڑائی اور اس کا رنگ بدل گیا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو کے قطرے گالوں سے بہتے ہوئے اس کی قمیض پر ٹپکے۔ جو اس نے اپنی ساڑھی کے پلو سے پونچھ لئے۔ وہ بس میں بیٹھی سواریوں کی طرف دیکھنے کے بعد کہنے لگی۔ "بی بی جی وہ ایک خوفناک دن تھا جس نے میری زندگی برباد کر کے رکھ دی۔ سردیوں کی ایک رات تھی زبردست برف باری ہو رہی تھی اور تیز برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں باہر جانا موت

سے کھیلنے کے برابر تھا۔ برف نے ساری کائنات کو سفید چادر سے ڈھک لیا تھا۔ میرا باپ فالج کی وجہ سے بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور اس کی دیکھ ریکھ بھی میرے ہی ذمّے تھی۔ میں اس کے بستر کو کانگڑی سے گرم کر رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی۔ پہلے سوچا کہ شاید تیز ہوا کی وجہ سے دروازے کے پٹ ہلتے ہیں۔ لیکن دستک تیز ہونے کی وجہ سے میں دوڑ کر دروازہ کھولنے گئی۔ میں یہ دیکھ کر دھنگ رہ گئی کہ ایک نوجوان برف سے بھرا ہوا اور سردی سے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ میں نے اُسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ اور وہ اندر آ گیا۔ میں اس کی مہمان نوازی میں لگ گئی۔ میں نے اُسے کانگڑی دی اور چائے پلائی۔ وہ بڑی دیر تک میرے باپ کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ بیچ بیچ میں میں اس کی طرف دیکھتی۔ مجھے وہ اپنا ہی کوئی جانا پہچانا لگا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ بھاری برفباری کی وجہ سے وہ کئی دن ہمارے گھر میں رہا۔ ایک دن جب میں اس کے لئے بستر بچھا کر واپس آ رہی تھی اس نے میرا بازو پکڑا۔ اس کا چھونا تھا کہ میرے انگ انگ میں جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا مجھ پر ایک نشہ سا چھا گیا مجھے معلوم نہیں کہ میں کب اسکی

چھاتی سے الگ ہوگئی۔ اس کا پیار مجھ پر جادر کر گیا۔ اس نے مجھ سے
شادی کرنے کا پورا یقین دلایا۔ میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئی۔
اب وہی میرے لئے سب کچھ تھا۔ میں اپنا عورت پن اور مریادا اس
کے حوالے کر چکی تھی۔ لیکن ایک دن وہ واپس آنے کا وعدہ کر کے چلا
گیا۔ اس کو نہ آنا تھا اور نہ ہی آیا۔ وہ بچی میرے اُسی پیار کا نتیجہ ہے۔
میں گاؤں بھر میں بدنام ہوگئی۔ میرا باپ بھی ایک دن مجھے ہمیشہ کے
لئے چھوڑ کر چلا گیا''۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ میں نے اس کی آنکھوں
کی طرف دیکھا۔ ''اس نے اپنا نام ''پرِیت'' کہا تھا۔ بس اور کچھ نہیں''
یہ کہہ کر وہ پھر چُپ ہوگئی۔

پریت نام سنتے ہی میگزین میرے ہاتھ سے گر گیا۔ پریت کی
صورت میری آنکھوں میں گھومنے لگی۔ اور میری چیخ نکلتے نکلتے رہ
گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ ابھی تک پریشان نظروں سے
میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ میری ساتھ والی سیٹ ابھی بھی خالی تھی۔
''آ۔ میں تجھے تیرے پریت کے ساتھ ملاؤں گی''۔ یہ کہہ کر
میں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا دیا۔ اتنے میں بس چل پڑی۔

چھٹی فراق والی

صبح کے سات بجے ہیں۔ چڑھتے سورج کی کنواری کرنیں گھنے درختوں سے چھن چھن کر زمین پر آرہی ہیں۔ اُداس اور پریشان سی جیسے کوئی ماتم منا رہی ہوں۔ اُوبڑ کھابڑ سڑک سے گاڑیاں تیزی سے دوڑ دوڑ کر نہ جانے کس قسم کے ہتھیاروں سے بھری چیختی چلاّتی کہاں جارہی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی سردی محسوس ہونے کی وجہ سے بستر سے نکلنے کو جی نہیں کرتا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ گاڑیوں میں سپاہی پیچھے بیٹھے آتے جاتے نظر آرہے ہیں۔ یوں تو ان کو دیکھ کر حوصلہ پیدا ہوتا ہے لیکن.... لیکن کبھی کبھی ان ہی لوگوں سے ڈر اور خوف بھی لگتا ہے۔ بازار سے گذرتے ہوئے پرسوں حمید ملا تھا۔ لگتا تھا اس نے پھرن کے نیچے کچھ چھپا رکھا ہے۔ اس سے پہلے وہ دیر تک خیر خیریت پوچھتا لیکن آج؟ میں نے بھی اس کے زیادہ قریب جانا مناسب نہ سمجھا۔

بائیں طرف سٹیٹ بنک آف انڈیا کے سامنے بی۔ ایس۔ ایف کا ایک سپاہی دیکھ کر میرا حوصلہ کچھ بڑھ گیا۔ سپاہی اپنی دُھن میں

مست ایک برقعہ پوش عورت کی طرف دیکھ دیکھ کر گا رہا تھا۔ ''چھٹے درد فراق والے لئے ....'' موت سے بے خبر سپاہی کی طرف دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ اور اس اُداس سپاہی کے قریب سے نکل کر میں بنک میں داخل ہوا۔ آج بھی فوجی ٹرکوں کے قافلے نہ معلوم کہاں جا رہے ہیں۔ نزدیک ہی کھڑا 'بابا' پوچھ رہا ہے ''پاپا یہ فوجی کہاں جا رہے ہیں؟'' میں اس کی طرف دیکھتا ہوں اور کوئی جواب دیئے بغیر بات کھا جاتا ہوں وہ اپنا سوال پھر دہراتا ہے۔ اور میں سُنی ان سُنی کرتا ہوں۔ اب بابا خاموش ہو جاتا ہے۔ مجھ سے اس چھوٹے سے سوال کا جواب نہیں بن پایا۔ بابا تسلی بخش جواب کا انتظار کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ بابے کے ننھے سے گلاب چہرے پر بھی ایک قسم کی عجیب سی اُداسی ہے۔ لیکن کیا معلوم یہ میرا اپنا ہی خیال اور اندر کی اداسی کا احساس ہو۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ جیسے ہجر کے مارے چہرے سے آنسو۔ کوئی خوش نہیں لیکن کوئی کچھ کہتا بھی نہیں۔ ہر شخص خاموش چپ چاپ۔ ایک موت کی خاموشی بس خاموشی۔ صبح سے ہر آنے جانے والے سے حال چال پوچھتا ہوں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ سب کے چہرے

مُرجھائے ہوئے سارا ماحول کچھ اجنبی سا لگ رہا ہے۔

ایک آدمی بپھرا ہوا یہ کہتا آگے بڑھا "بارہمولہ قصبے کے پار والے بازار میں کراس فائرِنگ سے چار سول اور ایک فوجی مارے گئے ہیں۔ حالات بہت تناو بھرے ہیں کرفیو لگا ہوا ہے۔" ہر طرف اداسی، پریشانی اور غم واندورہ کا عالم ہے۔ آتے جاتے لوگ لگتا ہے جیسے ایک دوسرے سے رُوٹھے ہوئے ہوں۔ کیا شکایت ہے کوئی کہے تو۔

بازار سُنسان، کھیت کھلیان اُجاڑ۔ موسم ماتم کناں اور سوکھا سا کھا۔ شام ہونے کو ہے سورج کی لالی اُفق کے ساتھ لگ کر زرد پڑ گئی ہے۔

دل میں سوالوں کا انبار لگا ہے لیکن سب کے مُنہ لٹک رہے ہیں۔ اور سبھی تھکے ہارے قدموں سے اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ فوجی گاڑیوں میں سپاہی ناہموار سڑکوں کی وجہ سے گاڑیوں میں اچھل رہے ہیں جیسے انسان نہیں بھیڑیں لدی ہوئی ہوں سبھی جینا چاہتے ہیں زندہ رہنا چاہتے ہیں لیکن کوئی ہے جو جینے نہیں دیتا۔ اسی بھاگم بھاگ میں انسان زندگی کے ماتم کی دہلیز پر آ کھڑا ہوا ہے۔

ایک پڑوسی دور سے دکھائی دیا اس کے ساتھ اور بھی کئی آدمی تھے سب اونچی آوازیں کچھ باتیں کرر ہے تھے۔ میرا پڑوسی (عزیز) میرے قریب سے گذرا۔ اس نے میری طرف دیکھا لیکن نہ میرے پاس رُکا نہ کوئی بات کی۔ اس کے چہرے پر غصّہ تھا۔ میں نے اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ جُٹائی۔

وہی شام وہی سڑک کا کنارہ۔ اس سڑک کے کنارے جس پر کبھی نئے شادی شدہ جوڑے چاندنی رات میں ہنستے کھیلتے چہل قدمی کرتے رہتے لیکن اب یہ سڑک سنسان تھی۔ آج اس پر کوئی ہنستے کھیلتے نہیں چلتا تھا۔ نہ ہی کسی کو کسی کا انتظار تھا۔ جیسے سب کچھ چھن گیا ہو۔ جیسے زندگی ایک لمحے میں رُک گئی ہو۔ سب کچھ یخ بستہ برف کے نیچے دب کر رہ گیا ہو۔ شام کا وقت ہر طرف خوف اور ڈر۔ نہ معلوم کل کیا ہوگا۔ چاروں طرف سنّاٹا۔ میں ٹی۔ وی کے پاس بیٹھا من بہلانے والے پروگرام کی طرف دیکھتا لیکن کیا دیکھتا ہوں؟ کیا چل رہا ہے؟ ذرہ بھر ہوش نہیں۔

خبریں چل رہی ہیں بس وہی کچھ۔ آج چھ دہشت گرد اور دو فوجی

مارے گئے۔ قصبے میں کرفیو لگا ہے۔ سخت تناو کی صورت حال ہے۔ خبر سن کر ہمارے چہرے مرجھا گئے اور ہم بجھی بجھی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

نہ معلوم کون لوگ مارے گئے کس کس ماں کی گود خالی ہوگئی کس کس کا سہاگ اُجڑ گیا۔ سبھی اندر ہی اندر رب کو یاد کرکے دُعائیں مانگ رہے تھے۔

دوسرے دن بنک کے اندر داخل ہوتے ہی میری نظر نئے آئے ہوئے کھڑے سنتری پر پڑی۔ جو بُجھا ہوا چہرہ لئے پریشان حال بُت نبا کھڑا تھا۔ کمرے کے دوسری طرف کچھ نیم فوجی سپاہی اداس اور غم وغصّہ سے بھرے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اُدھر تھوڑی دُور کچھ برقعہ پوش عورتیں آ جا رہی تھیں۔ لیکن آج یہ درد و فراق بھرا گیت نہیں گا رہا تھا۔

"نی چھٹئے درد فراق والئے

لے جا لے جا پیغام سوہنے یار دا"

(میرے ہجر و فراق والے پیارے خط

میرے معشوق تک میرا پیغام پہنچا دے)

رشتے نہیں ٹوٹتے

گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ تنگ پگڈنڈی کے دونوں طرف گھنی جھاڑیاں اور اونچے لمبے جنگلی درختوں کے جُھنڈ۔ دور تک کہیں کوئی بستی نظر نہیں آرہی تھی۔ درختوں کی شاخوں کو زور زور سے ہلاتی اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ چوٹیوں سے آنے والی تیز ہوا سے دل پر خوف چھا جاتا تھا۔ میں مُڑ مڑ کر ہنس راج کی طرف دیکھتا۔ جو میری دونالی بندوق لئے میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ معلوم نہیں اس کی لمبی گھنی مونچھوں سے میں ڈر کیوں رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس کا بے فکری سے چلنا مجھے سہارا بھی دے رہا تھا۔ ''ہنس راج اب کتنا دُور جانا ہے'' میں نے آس پاس کا کسی قدر جائزہ لیتے اور خوفناک گھنیرے سائے کو دیکھ کر اس سے پوچھا۔ اور اس کا جواب سُنے بغیر کہا ''ہنس راج ہمیں یہیں سے واپس لوٹنا چاہیئے۔ یہاں کوئی بستی نظر نہیں آرہی ہے''۔ اس نے آگے چلنے کے لئے مجھے راستہ دیتے ہوئے کہا ''جناب میرا خیال ہے وہ بھاگ گئے ہیں۔ ان کو شاید ہمارے آنے کی خبر مل گئی ہے لیکن ہم رات راجہ صاحب کے بنگلے میں گذاریں گے۔ پھر

کل دیکھا جائیگا"۔اس نے اونچے گھنے درختوں میں سے ایک دور سے نظر آتی روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"اب تو کوئی آدھ گھنٹے کا رستہ ہے وہاں ایک نوکر ہی تو رہتا ہے لیکن کبھی کبھار بلند خان کی اکلوتی لڑکی بھی آتی ہے۔"

مجھے اوڑی کے اس علاقے میں نئے رینجر کے طور بھرتی ہونے کے بعد حال ہی میں بھیجا گیا تھا۔آج پہلی دفعہ یہاں آیا تھا اس لئے ہنس راج کو جو بہت عرصہ سے اس علاقے میں فارسٹ گارڈ کی حیثیت سے ڈیوٹی دے رہا تھا۔راستہ دکھانے کیلئے ساتھ لانا پڑا۔

یہ علاقہ عمارتی لکڑی کی سمگلنگ کے لئے بدنام تھا۔نامبلہ نام کے اس گاؤں کے قریب وجوار میں گھنے درخت، سرسبز میدان، چراگاہیں اور ایک خوبصورت آبشار دل کو سکون اور دماغ کو فرحت عطا کرتے تھے۔

"صاحب وہ دیکھو بنگلے میں روشنی بھی جلتی ہے۔لگتا ہے راجہ صاحب کی لڑکی بھی یہاں ہے" تھوڑی ہی دیر میں ہم اخروٹ کی خوبصورت لکڑی کے بنے اس پرانے طرز کے بنگلے میں تھے۔

اور اس شور غل سے دور وادی کی تنہائی اور خاموشی سے سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ شی شی کرتی ہوا کے جھونکے بجلی کی روشنی کو درختوں کی ہلتی شاخوں سے آنکھ مچولی کھیلنے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اسی اثنا میں نوکر ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں بھی جگمگ کرتی روشنی کشمیری قالین اور دیواروں پر لٹکتی تصویریں مسحور کر رہی تھیں۔ جو راجہ صاحب کی نسبت اندازہ لگانے کے لئے کافی تھا۔

صبح ہوتے ہوتے میری آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی کی سنگیت بھری سُریلی آواز نے مجھے جگا دیا "میں رات بہت تھک چکی تھی۔ اس لئے میں آپ سے ملنے نہ آسکی۔ نہ معلوم الفُو نے آپ لوگوں کو کھانے کو کچھ دیا بھی تھا۔ چلئے ناشتہ کیجئے۔" اس نے ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میری جانی پہچانی صورت لگتی ہے" میں حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اسے شہر میں کئی بار دیکھا ہے۔ اس کے گلابی چہرے کی طرف دیکھ کر میرے دل میں ایک ملائم سا جذبہ رقص کرنے لگا۔ حُسن کے اس شاہکار کو دیکھ میرا رُواں رُواں بیقرار ہو اُٹھا۔

شاید جذبات قابو میں نہ کرسکتا اگر وہ چائے کی کیٹل اور ٹرے لے کر دوسرے کمرے میں نہ چلی جاتی۔

ہنس راج جلدی تیار ہونے کیلئے کہہ رہا تھا۔ اور میں ابھی بھی چائے کی چُسکیاں لیتا دیوار پر لٹکتی تصویروں میں کھوگیا تھا۔ اچانک میری نظر ایک تصویر پر ٹِک گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر کی طرف دیکھتا رہا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ''کیپٹن آر۔ ایس سَرنا اینڈ مسز سَرنا''۔ میری حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ اسی دوران اُسی سریلی آواز نے مجھے جھنجھوڑا جیسے کیپٹین کو خاموش دیکھ تصویر کی مسز سرنا کہہ رہی ہو''میں جانتی تھی کہ تم تصویر دیکھ کر حیران ہوجاو گے۔ تم نے مجھے کئی بار شہر میں دیکھا ہوگا۔ میں جانتی ہوں''۔ وہ دروازے سے اندر آئی۔

اُسے اتنا قریب دیکھ کر میں اس کی سجل آنکھوں کا تیکھا پن برداشت نہ کرسکتا۔ اور اس سے بات کرنے کیلئے الفاظ تلاش کرنے لگا۔ اس کے لمبے لمبے کالے بالوں میں کہیں کہیں سفید لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ صبح کی خوشگوار پھیلتی روشنی میں چہرہ خوب نکھر آیا تھا۔ وہ بھرے بھرے قدم اٹھاتی تصویر کے ساتھ میرا تعارف کررہی تھی۔

''سردار جی ہم مظفر آبادی ہیں۔ جب سنتالیس ہوا میرے پتا جی مارے گئے۔ ہماری ساری جمع پونجی فسادیوں نے لوٹ لی''۔ وہ اب بھی تصویر کے نیچے کھڑی تھی۔ ''میری ماں مرچکی ہے۔ مرنے سے پہلے اُسی نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسے طرح طرح کی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پھر راجہ صاحب نے میری روتی بسورتی ماں کو اس بنگلے کی زینت بنایا۔ ماں میری وجہ سے راجہ کی ہر خواہش پوری کرتی رہی۔ ماں کی دیکھ ریکھ میں جوان ہوگئی۔ لیکن جوانی پر قابو نہ رکھ سکی۔

ایسی ہی خوشگوار رُت تھی لیکن رات بہت ہیبت ناک۔ 1971 کی جنگ چھڑ گئی تھی۔ دوسرے دن کپٹن سرنا حسب معمول ہمارے یہاں آیا تھا ہم نے بابا فرید کے آستانے پر جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ایک دوسرے کے پیار کا وعدہ کیا۔ شام کو گھر لوٹے ہر طرف گولیوں کی گھن گرج ہوا۔ بارود سے بدبودار اور آتش بار ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے رات رُکنے کو کہا۔ میری آنکھ لگ گئی پھر نہ معلوم وہ کب جا چکا تھا۔ وہ مرزا تھا لیکن میں صاحباں نہ بن سکی۔ پھر وہ کبھی یہاں نہیں آیا''۔ وہ اپنی تصویر کے نیچے کھڑی تھی۔ ''یہ ساری اُسی اُلجھن کی تصویریں ہیں۔

اور اس کی داستان جنگلی پھولوں کی طرح اپنے اندر ہی اندر وقت کے
ساتھ ساتھ مُرجھائے جا رہے ہیں''۔ ہنس راج جا چکا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے گالوں سے نامبلہ کے آبشار کی طرح
آنسو بے تحاشہ بہے جا رہے ہیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے اس کے
اجڑے ہوئے باغ کو لہلہانا ہے۔ میری انگلیاں اس کی کالی اُلجھی زلفوں
سے کھیل رہی تھیں۔

فرض

پرانے طرز کا بنا ہوا تین منزلہ مکان۔ ہم دونوں اس مکان میں بیٹھے ہیں۔ مکان میں خاموشی اُداسی، درد وغم، تمنائیں ڈیرہ ڈالے ہیں۔ سامنے اونچے اونچے برف سے ڈھکے پہاڑ قدرت کا نظارہ پیش کر رہے ہیں۔ وہ چار پائی پر بیٹھی ہے اور میں سامنے کرسی پر۔ ایک کونے میں بڑی ٹیبل پر پانی کا جگ رکھا ہے۔ میں کبھی پانی کے جگ کی طرف اور کبھی سُدیش کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ سخت پیاس لگی ہے لیکن اٹھنے کی سکّت نہیں۔

زندگی کشمکش میں کھٹے میٹھے تجربوں سے اُبھر کر جہاں اپنی دنیا کو پھولوں کے گلدستے جیسا سجانا چاہا تھا۔ وہاں کانٹوں کی باڑھ میں پھنس کر قدم قدم پر رکاوٹیں اور ٹھوکریں کھا کھا کر تھک ہار کر بے بسی کے گرداب میں گھر گیا۔

سُدیش نظریں جھکائے بُت بنی بیٹھی ہے۔ ابھی تک ہماری آپس میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کا اُڑا ہوا چہرہ یادوں کے انبار تلے دبا افسانہ لگ رہا ہے۔ وہ اُبھرا اُبھرا دلکش تیکھے نین نقش والی سدیش پر یہ

اُداس، مایوس اور پریشان مکھوٹا۔ میں آج بارہ سال کے بعد یہاں واپس آیا ہوں۔ میں اپنے آپ کو اب بھی وہی جگدیش سمجھ رہا ہوں۔ وہی ستائیں سال کا جگدیش۔ اُن ہی دنوں کا ایک منظر میری نظروں میں اُبھر رہا ہے میں سُدیش کے سامنے بیٹھا ٹھنڈی خوشگوار ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ سُدیش کی چُنری ہوا میں لہرا کر مجھے دعوت نظارہ دے رہی ہے۔ میں تیز طرار اور شریر جگدیش سُدیش کو ایک محبت نامہ لکھ کر اپنے پیار کی خواہش کر بیٹھا۔ سدیش ایک آزاد خیال حُسن وشباب کا مرقع۔ لیکن وہ میرے پیار کو غلط سمجھ بیٹھی۔ گھر، خاندان اور رشتے میں یہ بات پھیل گئی۔ سب نے میری خوب خبر لی۔

میں خاموش اور اُداس رہنے لگا۔ لیکن اس دکھ کو برداشت نہ کر سکا۔ وقت سائے کی طرح دھیرے دھیرے ڈھلتا گیا۔ میں سرکاری ملازم بن گیا۔ اور سُدیش سے دُور چلا گیا۔ وقت نے ایک خطرناک کھیل کھیلا۔ 1947 کی جنگ شروع ہوئی۔ انسان، بوڑھے، بچے، عورتیں، مرد خاک وخون میں رُندھ گئے۔ آدمی آدمی کے خون کا پیاسا بن گیا۔ شب وروز گذرنے کے ساتھ ساتھ دہشت کا زور بڑھتا

ہی گیا۔ لوگ گھروں سے بے گھر ہو گئے بستیوں کی بستیاں اُجڑ گئیں۔

لیکن سُدیش کی صورت میری نگاہوں میں ہمیشہ گھومتی رہی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سُدیش پیار اور وفا کی بھیک مانگ رہی ہے۔ اس کی زبان بند تھی لیکن آنکھیں کھلی تھیں۔

اب سدیش میرے سامنے ہے اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے ہیں۔ لیکن ماضی کی یادوں کی تپش سے خود بخود سوکھ رہے ہیں۔ میری بھی آنکھیں نم ہو گئیں میں سدیش کا دُکھ برداشت نہ کر سکا۔

سُدیش ہچکیاں لے لے کر کہنے لگی "جگدیش مجھے معاف کرنا۔ معلوم نہیں میں انجانے میں تمہارے ساتھ کیا کر بیٹھی۔ رب نے مجھ سے اس کا خوب بدلہ لیا۔" "وہ جنگ میں مارا گیا۔ اب میں بے سہارا ہوں۔ مجھے سہارے کی ضرورت ہے"۔

مجھے لگ رہا ہے جیسے میں سحر پھوٹتے ہی گہری نیند میں سہانے سپنوں کا مزہ لوٹ رہا ہوں۔ سدیش کی پرانی یادیں اور باتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں اس کا ماضی میرے سامنے آرہا ہے۔

"جگدیش مجھے سہارے کی ضرورت ہے"۔ سدیش کی یہ آواز

میرے دماغ کی تہوں میں داخل ہوئی۔ چاروں طرف سے ''سہارا،
سہارا'' گونج رہا ہے۔

میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ بے حس و حرکت۔

اسی اثناء میں مجھے ایک ملائم اور معصوم آواز نے جیسے گہری نیند
سے جگایا ہو ''پاپا۔ گھر چلو نا۔ میں ممّی کے پاس جاؤں گا۔ مجھے ممّی کے
پاس لے چلو۔ پاپا۔ بہت دیر ہوگئی''۔

اور فرض کی بھول بھلیوں میں سدیش کی آواز آہستہ آہستہ مدّھم
ہوتی چلی گئی۔

تو اور کیا کرتا

اُتّم سنگھ نے پرانی دلی میں ڈیرہ ڈالا۔ جب پرانی دلی پرانے خیالوں کی دلی تھی۔ ہوا میں اکتوبر نومبر کی تھوڑی خنکی۔ شانتی کی گود میں دو سال کا ننھا جگتار۔ اُتّم سنگھ بھی دوسرے مہاجروں کی طرح ریلوں کی پُر ہجوم لمبی قطار میں لگ گیا۔ یہاں آ کر اگرچہ اسے اپنی بھوک محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن جگتار کی بھوک اور شانتی کی جوان اُمنگوں نے اُسے تڑپا دیا۔ یہاں کی ڈھیروں مصیبتوں نے اس کی نیندیں اُڑا دیں۔ پاکستان میں اپنے پیچھے چھوڑی زمین جائداد، وہاں کا عیش و آرام یاد کر کے رات دن ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا۔ مہاجر کمپوں کی گھٹن میں شانتی کی پریشانی اور جگتار کا ایک ایک قطرے دودھ کیلئے ترسنا اُسے کبھی چین کی نیند بھی نہیں سونے دیتا۔

اُتّم سنگھ رات بے چینی میں گذارتا صبح سویرے بھوکا پیاسا نکل پڑتا۔ اِدھر اُدھر محنت مزدوری کر کے کچھ کما کر لے آتا۔ لیکن اس طرح کتنی دیر گذارہ چل سکتا۔ جفاکش جوان اُتّم سنگھ کتنی دیر بے کار بیٹھا۔ شانتی کی گود میں پلنے والے جگتار کے بچپن کی یہ تکلیفیں کب تک سہہ لیتا۔ اس نے ایک ریڑی کرائے پر لی اور اسی پر روٹی وغیرہ بیچنے لگا۔ اس

طرح دو وقت کی روٹی نصیب ہونے لگی دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ریڑی کے پاس خریداروں کی بھیڑ لگنے لگی۔

اُتّم سنگھ آہستہ آہستہ مفلسی کے دکھ درد بھولنے لگا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے 1947 کے خوفناک فساد دیکھے تھے اپنی نظروں کے سامنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔ ماؤں بہنوں کو اپنی عزت بچانے کیلئے دریاؤں اور کنوؤں میں ڈوب کر اپنی جان دیتے دیکھا تھا۔ بزرگوں اور بچوں کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ اس زندگی میں جہاں اس نے ماں باپ کا لاڈ پیار دیکھا تھا وہیں اس کے سینے میں بے شمار درد و غم بھی چُھپے ہوئے تھے۔ اسی اُتھل پُتھل کے دوران اتم سنگھ کے گھر دوسرے بیٹے سنتو کھ سنگھ نے جنم لیا۔

چند روز بعد اُتّم سنگھ نے پرانی دلی چھوڑ کر نئی دلی میں ایک بنگلہ بنایا۔ ریڑی چھوڑ کر ایک ہوٹل چلانے لگا۔ لیکن اس خوشگوار تبدیلی کے ساتھ ساتھ وقت نے ایک اور کروٹ لی۔ جس زندگی نے دکھ سکھ برداشت کر کے ایک دوسرے کو سہارا دیا تھا اُسے آج بڑھاپے کی پہلی ہی منزل پر بیوی کی جدائی نے آ پکڑا۔ کہتے ہیں نا "جوانی میں بیوی کا

خاوند نہ چھوٹے اور بڑھاپے میں خاوند کی بیوی نہ چھوٹے" 1984 کے سکھ مخالف فسادنے اتم سنگھ کے ہاتھ کی چھڑی چھین لی۔ شانتی اس سکھ مخالف فساد میں بچوں پر قربان ہوگئی اور اتم سنگھ بے سہارا ہوگیا۔ اس دردناک حادثے نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس نے ہوٹل کا سارا کام بیٹوں کے ہاتھوں میں دیا۔ اپنی گرتی صحت کی وجہ سے اُتّم سنگھ مانو اپاہج ہوکر رہ گیا۔ اپنی محبت کی وجہ سے اس نے اپنے بچوں کو ماں کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی۔ اور ان کی شادی بڑے چاو سے انجام دی۔

آہستہ آہستہ دونوں بھائی اپنی اپنی گھریلو مصروفیات میں گھِر گئے۔ اور اتم سنگھ بیماری اور بڑھاپے کے اندھے کنویں میں دھنستا چلا گیا۔

اب دونوں بھائی الگ الگ رہنے لگے۔ مکان کی نچلی منزل جگتار نے اور درمیانی منزل سنتوکھ نے سنبھالی۔

اُتّم سنگھ کو دمے کے مرض نے بُری طرح گھیرا۔ اب وہ شاذو نادر ہی گھر سے باہر جاتا۔ دونوں بھائیوں کے اپنے بچے بھی اب جوان ہو چکے تھے۔ اور ان کا اپنا گھریلو بوجھ بڑھ رہا تھا۔ کہاوت ہے "جس سے میں نے جنم لیا اس کو میں پیارا۔ جس نے مجھ سے جنم لیا مجھے

وہ پیارا'' جگتار اور سنتو کھ کا دھیان بھی اب قدرتی طور پر اپنے بچوں کی طرف رہنے لگا۔

اتم سنگھ کھانسی کے مرض کی وجہ سے اب کسی کے پاس بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ جگتار کی بیوری نے ایک دن تنگ آکر اپنے پتی سے کہہ ہی دیا ''آج بابا جی کو کھانسی نے سخت تنگ کیا۔ اتنا کھانس رہے تھے کہ سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ حالانکہ دوائی بھی دی تھی۔ ادھر سے آج میری دیدی بھی آئی تھی۔ ہم روٹی کھانے ہی لگے تھے کہ اتنے میں بابا جی کو اس قدر بلغم اٹھنے لگا کہ دیدی روٹی بھی نہ کھا سکی۔ کیوں نہ بابا جی کیلئے سنتو کھ والے بائیں کمرے میں چارپائی ڈال دی جائے۔ خالی کمرہ ہے روٹی پانی وہیں دیا کرینگے اور ابا جی بھی کسی خلل کے بغیر آرام سے رہینگے۔''

دوسرے دن اُتّم سنگھ درمیانی منزل کے بائیں کمرے میں کسی گلے شکوے کے بغیر جا بیٹھے۔ کچھ دنوں تک کھانا پینا اچھی طرح ملتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ کھانا ملنے میں دیر ہونے لگی۔ کئی دن بعد دنوں بھائیوں نے باپ کو کھانا دینے کیلئے باری لگا دی۔ لیکن اب یہ باری والی روٹی پہنچانے میں بھی سُستی آئی اور کھانا بہت دیر سے ملنے لگا۔ اُتّم سنگھ

بھاری من سے یہ سب کچھ برداشت کرتا رہا۔

ایک دن چھوٹے بیٹے سنتوکھ کے گھر میں مہمانوں کے آنے کی خوب چہل پہل تھی۔ سارا گھر پُر رونق اور خوش وخرم تھا۔ اُدھر پاس والے کمرے میں اتم سنگھ کھانسی سے تڑپ رہا تھا۔ وہ بار بار بلغم تھوکتا اِدھر مہمانوں کا کھانا حرام ہو رہا تھا۔ بس پھر کیا تھا دوسرے دن اتم سنگھ کو مکان کی آخری تیسری منزل میں لے جایا گیا۔ اتنے اونچے مکان سے اوپر نیچے آنا جانا اس کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔ اس کی حالت قابل رحم بن گئی۔ شانتی کا پیار، وہ جوانی کے شب وروز، پُر ہول فسادات، گھر سے بے گھر ہونا، 1984 کے حادثات، وہ چلچلاتی دھوپ، جون جولائی کی جُھلسا دینے والی گرمی، دلی کی وہ پرانی تنگ وتاریک گلیاں۔ اتم سنگھ سوچتا کہ وہی سب کچھ اچھا تھا لیٹے لیٹے شانتی کی تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ سرد آہیں بھرتا، کروٹیں بدلتا اور پھر خود ہی اپنے آپ کو تسلی دیکر رہ جاتا۔

اس کے باوجود اس نے اپنے بچوں سے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ ایک دن اُتّم سنگھ کافی دیر تک کھانے کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن کھانا نہ آنا تھا نہ آیا۔ وہ بچوں کی طرح بلبلانے لگا۔ کافی دیر تک اوپر نیچے

آوازیں دینے لگا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

ایک پڑوسی نے اس کی آوازیں سن کر کہا۔ بھائی اُتّم سنگھ آپ کے دونوں بیٹے بال بچوں سمیت کہیں گئے ہیں۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اُتّم سنگھ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا بڑھاپا اُبل پڑا۔ اُسے لگا جیسے ایک لمحے میں اس کا دمّہ خشک ہو گیا ہو۔

کچھ دن بعد جب اس کے بیٹے واپس آ گئے۔ تو گھر کا سارا سامان نیچے صحن میں تِتّر بتّر پڑا تھا۔ اُن کے چہرے فق ہو گئے۔ انہوں نے گھر کے ورنڈے پر کھڑے ایک بزرگ سے پوچھا۔ "یہ سارا کچھ کیا ہو گیا ہے، ہمارے پاپا جی ٹھیک ہیں کیا؟" اور بھی کئی سوال انہوں نے ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔ وہ بزرگ جو بڑی شانِ بے نیازی سے ورنڈا پر ٹہل رہا تھا۔ کچھ کاغذات اُن کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگا "یہ تمہارے اس بنگلے کے کاغذات ہیں جو ہم نے کل ہی تمہارے باپ سے خریدا ہے" "ا.....و.....ر..... پاپا جی.....؟"

یہ کہتے ہوئے دونوں بھائی حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔

وہائٹ کالر

سب لوگ اس کی عزت کرتے۔ اپنی میٹھی شائستہ زبان، سلجھے ہوئے عادات کی وجہ سے اس کا احترام کیا جاتا۔ چٹّی سفید داڑھی، خوبصورت صاف شفاف، سلیقے سے بندھی پگڑی اور پُر کشش صورت۔

ہر شخص اس کے ساتھ چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے میں فخر محسوس کرتا۔ بازار کی طرف وہ کبھی کبھار ہی نکل جاتا۔ جاتا بھی تو بس کسی چھٹی کے دن اور اکثر آدھے رستے سے ہی بس میں سوار ہوکر واپس گھر لوٹ آتا۔ اگر چہ اس کے کچھ دوستوں کو اس کی یہ عادت پسند نہیں تھی لیکن لوگ اکثر اس کی تعریف بھی کرتے۔ بازار میں ملتے وقت کئی دوستوں نے چوک والی حلوائی کی دکان پر اسے چائے پینے کی دعوت دی لیکن وہ بڑے سلیقے سے معذرت چاہتا۔

آخر ایک روز دوست اُسے مجبور کر کے چائے پینے ہوٹل پر لے ہی گئے۔ چائے پینے کے بعد وہ دوستوں سے جلدی اجازت لیکر واپس جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں سامنے والی دکان کے بزازی

والے نے سلام دُعا کی۔ یہ سُن کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُسے اپنی خوبصورت سجی سجائی پگڑی ڈھیلی پڑتی محسوس ہوئی۔ دوستوں نے اس کی کمزوری تاڑلی اور وہ اپنے کیئے پر پچھتانے لگے۔ وہ بھاری قدموں سے گھر پہنچا، لیکن رات بھر وہ سو بھی نہ سکا بس کروٹیں بدلتا رہا۔

دوسرے دن وہ بزاز کی دکان پر پہنچا اور بڑے پیار سے کہنے لگا ''خواجہ صاحب! یہ کچھ پیسے آپ لے لیں۔ باقی رقم بھی بہت جلد ادا کروں گا۔ لیکن مہربانی کر کے آیندہ سب کے سامنے سلام نہ کیا کریں۔ میں خود ہی حساب بیباق کروں گا''۔ دکان دار اِسے تکتا ہی رہ گیا اور اپنے کیئے پر پچھتانے لگا۔

دوپہر کی تپش

مکھن سنگھ کے پاس جب اِدھر اُدھر کی سچّی جھوٹی ڈھیر ساری خبریں جمع ہو جاتیں اور ان باتوں سے اس کا پیٹ پھول جاتا۔ وہ اپنا پیٹ ہلکا کرنے کیلئے جلدی جلدی میرے گھر کی طرف آجاتا۔ اس کے پاس تو وقت کی کوئی قیمت بھی نہیں ہے۔ چاہے وقت ہو یا بے وقت (فرصت ہو یا نہو) اِدھر اُدھر کی کھٹی میٹھی گپ شپ کرتے اصل بات کی طرف آجاتا۔ جب تک وہ پوری بات نہ کرے اس کے دل کا بوجھ ہلکا بھی نہیں ہوتا۔ اس کے بات کرنے کا طریقہ اتنا مزیدار ہوتا کہ سننے والا سارا کام چھوڑ کر اس کی باتیں سننے میں مست ہو جاتا۔

آج اس کو سویرے سویرے دور سے ہی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا مشکل سے آج چھٹی کا دن مل گیا تھا۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام نبھانے ہیں۔ ادھر سے مکھن سنگھ جی......... میں نے گھر والی کو آواز دی "لو۔ مکھن سنگھ جی سویرے سویرے آ گئے۔ مغز کھپائی کرنے۔ سب کام کاج دھرے کے دھرے رہ جائینگے"۔ مکھن سنگھ کی صورت دیکھ کر میں سوچنے لگا۔ کہ آج کچھ خاص بات لگتی ہے۔ مکھن سنگھ کبھی اس طرح نہیں چلتا تھا یہ میں دل ہی دل

میں سوچتا رہا۔ اتنے میں وہ ہانپتا کانپتا میرے قریب پہنچا۔ اس کے اُترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھکر میں بھی کچھ گھبرا سا گیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سرد آہ بھری۔ پسینہ پونچھ لیا۔ کیا بات ہے خیریت ہی ہے کیا؟ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟۔ "یار جگتار کچھ نہ پوچھو۔ آج بہت بُری خبر ہے۔ وہ بہت پریشان ہو کر جلدی جلدی کہنے لگا۔ اس کا چہرہ اتنا اُترا کبھی نہیں دیکھا تھا"۔ کچھ نہ کچھ کرنا پڑیگا۔ ورنہ کرتار خودکشی کرے گا۔ کرتار سنگھ کا نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اور دل کی تڑپ بڑھنے لگی۔ کرتار کو کیا ہو گیا ہے ذرا جلدی بتاو؟ "یار اس کی سب سے چھوٹی بیٹی کیا نام ہے ارے کیا نام ہے اس کا..... پاروی.... بھاگ گئی"۔ ہاں ہاں جلدی بتاو۔ کس کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ بھا....گ.....گئی........ یہ سنتے ہی جیسے جان ہی نکل گئی ہو۔ ہم تینوں بچپن کے دوست ہیں۔ مکھن سنگھ، کرتار سنگھ اور میں۔ کرتار سنگھ کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہ کرنے کی وجہ سے آرڈی ننس میں لیبر بھرتی ہوا۔ بیٹا ہونے کی خواہش کرتے ہوئے تین بیٹیوں کا باپ بن گیا۔ تینوں بیٹیاں ایک سے ایک خوبصورت جیسے چاند کا ٹکڑا۔ اس کو بیٹے کی بڑی تمنا تھی۔ جب بھی ملتا تو کہتا تھا۔ یار تارے اب میں بوجھ ڈھوڈھو کر تھک گیا

ہوں۔ میری کمر بھی ٹیڑھی ہونے لگی ہے۔ اگر ایک ہی بیٹا ہوتا میرا کچھ نہ کچھ
بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ اچھا خدا کی مرضی"۔ وہ سرد آہ بھر کر چُپ ہو جاتا۔ شام کو
جب گھر لوٹتا تو تھکاوٹ کی وجہ سے منہ زمین کے ساتھ لگتا دکھائی دیتا۔ لیکن
آج کی خبر سنتے ہی میرا تو دم مانو نکلنے لگا۔ دہشت گردی کو اتنے سال ہو گئے
ہیں۔ آج تک ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ مگر آج... ہماری پگڑی پر ہاتھ
پڑا ہے۔ دوسرے دن جب میں دفتر پہنچا مجھے لگا جیسے میری کوئی چوری پکڑی
گئی ہو۔ لگ رہا تھا جیسے ہزاروں زہریلے سانپ مجھے ڈسنے کے لئے تیار
بیٹھے ہوں۔ دفتر والوں کے ساتھ آنکھیں بھی پوری طرح نہیں ملا سکا۔
میرے دل میں آج ایک عجیب طرح کی آگ لگ گئی تھی۔ مجھے سارے
لوگ اپنے دشمن لگتے تھے۔ اتنے میں کرتار میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ لگ رہا
تھا کہ وہ رات بھر نہیں سویا تھا۔ نیم جان۔ آنکھوں میں آنسو چھلکتے۔ منہ سے
آواز بھی مشکل سے نکلتی تھی۔ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ فوراً آنسوؤں کی تیز دھار
نکل پڑی۔ جیسے آنسوؤں نے سب کچھ بیان کیا ہو۔ "کرتار۔ میری۔ چنّی۔
کہ..... ساتھ بھاگ گئی۔ وہ اُسے مار ڈالینگے"۔ دل چاہتا تھا کہ میں اُسے
دھکے مار مار کر دفتر سے باہر نکال دوں اور کہوں۔ اُلّو کے پٹھے تجھے اپنی چنی کی

فکر ہے۔ لیکن جو قوم پر بیت رہی ہے اس کے بارے میں بھی سوچا ہے کیا؟ پھر سوچا امید پر دنیا قائم ہے۔ غریب کو روزی روٹی کی تلاش میں دن بھر بوجھ کندھوں پر لادکر..... مشکل سے رات کو کہیں چار گھڑی آرام نصیب ہوتا ہے۔ اس میں بھی گھر والوں کے ساتھ کتنی مغز کھپائی کرتا ہوگا۔ میں نے اس کی پریشانی محسوس کی۔ ہم نے گردوار کمیٹی کو اپنی بپتا سنائی۔ ان کے سامنے فریاد کی۔ سکھوں کا بڑا اجلاس ہوا۔ لمبی چوڑی تقریریں ہوئیں۔ بزرگوں اور جوانوں نے باتوں کا خوب مزہ لیا۔ لیڈروں کے لچھے دار الفاظ سے کرتار کی گردن زمین کے ساتھ لگ گئی۔ اس کی کمر تو پہلے ہی بوجھ ڈھو ڈھو کر ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ اور آج اس ہجوم میں الفاظ کی بوچھاڑ نے رہی سہی کسر بھی پوری کی۔ وقت گذرتا گیا۔ کرتار سنگھ حادثے کو نہ بھول پایا۔ بھولتا بھی کیسے۔ اُسے اپنی دستار میں لگا ہوا داغ ابھی بھی تازہ دکھائی دیتا اور سوچتا کہ یہ داغ کسی صابن سے نہیں دُھل سکتا ہے۔ وہ جب کبھی بازار جاتا اس کو سب ہی لوگ پرائے دکھائی دیتے۔ جہاں اس بات نے اس کا لہو چوس لیا تھا وہیں اپنی دو جوان لڑکیوں کی شادی کا خیال آکر اس کے سینے میں آگ سی بھڑکنے لگتی۔ میں آج بڑی مدت کے بعد کرتار کے گھر جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا

کہ مکھن سنگھ کو گھر سے ساتھ لیکر جاؤں گا۔ اورا کھٹے ہی چلیں۔ لیکن مکھن سنگھ راستے میں میری ہی طرف آتا دکھائی دیا۔ بہت ڈر اور خوف لگ رہا تھا۔ ''چل۔ چل۔ واپس جا۔ بازار نہ جانا۔ پرانے قصبے میں حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ تم نے سُنا کرتار کی چنی جس کے ساتھ بھاگ گئی تھی اس کا سارا کنبہ زہر کھا کر مر گیا ہے، کہتے ہیں چنّی نے ہی کھانے میں زہر ملایا تھا'' ۔ ہم ڈر کی وجہ سے بازار نہیں جا سکے اور سیدھے کرتار کے گھر جا پہنچے۔ کرتار عجیب حالت میں اپنا سر ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھا تھا۔ اور رسوئی میں اس کی بیوی اور بیٹیاں۔

بیٹیوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ آنکھوں کے کنارے سیاہ پڑ گئے تھے۔ لگتا تھا رات بھر نہیں سوئی ہیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لوک لاج کی وجہ سے کرتار کے گھر جانے کو دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی بیوی ہمارے قریب آ کر بیٹھی اس دوران کرتار نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی بیوی نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے تم ہمیں بھول گئے۔ رشتے داروں کو تو ہمیں بھولنا ہی تھا۔ وہ تو سارا الزام مجھ بدنصیب پر ہی

ڈالتے ہیں۔ لیکن آپ تو ہمارے سب حالات سے واقف تھے۔ کیا اس سے پہلے تم نے ہمارے بارے میں کوئی بات سُنی تھی؟ جیسے تیسے اپنا گذارہ کرتے ہیں۔ بیٹیوں کو کبھی کسی قسم کی کمی یا تنگی نہیں ہونے دی۔ ہماری چنّی میں کیا کمی تھی۔؟ کیا وہ اس قسم کی تھی؟ تم نے اب سب کچھ سُن لیا۔ وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی؟ اگر وہ اپنی مرضی سے گئی ہوتی تو وہ ایسا قدم نہ اٹھاتی۔ کرتار نے ایک گیلا سا مشکل سے پڑھنے کے لایق خط سامنے رکھا۔ جو تین دن پہلے کا لکھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر ہمارے دلوں میں ایک نیا جذبہ اور جوش پیدا ہوگیا۔ ہماری چھاتیاں گزوں پھولنے لگیں ہمیں اپنا قد دوگنا چوگنا اونچا لگنے لگا۔ دل ہی دل میں چنّی کے لئے عزت اور احترام پلٹ آیا۔ جس کرتار کے لئے ہمارے دلوں میں وہ احترام اور عزت ختم ہوگیا تھا۔ یہ خط پڑھ کر من ہلکا ہونے لگا۔ کرتار کے لئے ہمارے دلوں میں پھر وہی عزت اور احترام جاگ اٹھا۔ ہمارے سر آج فخر سے اونچے ہوتے لگ رہے تھے۔

سرنڈر

حکومت نے اسے نہ صرف ایک لاکھ روپے امداد کے طور دیئے بلکہ اس کی عمر قید بھی معاف کردی۔ جیل سے نکل کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ آج ایک نئی خوشی محسوس کررہا ہے۔ آج اسے ہر طرف ایک نیا ہی رنگ نظر آتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتا جیسے اس نے آج ہی جنم لیا ہو۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں، ناچتے گاتے لوگ، لہلہاتے کھیت، سرسبز درخت اسے اپنے استقبال کیلئے کھڑے دکھائی دیئے۔ وہ بہت دور نکل گیا اور ساری کہانی اس کے گرد گھومنے لگی۔ اُسے لگا جیسے وہ پھر ''سیتل'' سے 'سجن' بنا ہو۔

اس کا نام سیتل تھا۔ اور اسے سجن بھی کہتے تھے لیکن سجن کو صرف پولیس ہی جانتی تھی۔ وہ جہاں جاتا تھا گرفتاری کے اشتہار لگے ہوتے۔ اُسے زندہ یا مردہ پکڑنے کے لئے حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپے کا انعام رکھا گیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ بُجھا بُجھا تھکا ہارا سا لگ رہا تھا۔ اگر چہ آج اس کے پاس کئی ہزار روپے تھے جو اس نے جواریوں سے لوٹ لئے تھے لیکن وہ کچھ فکرمند سا لگ رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ

ان پیسوں سے ہتھیار نہیں خرید سکتا تھا۔ پھر بھی وہ قدرے تسلّی محسوس کر رہا تھا کہ آج پہلی بار کسی خون خرابے کے بغیر پانچ ہزار روپے حاصل کئے تھے۔ شاید آج سجن کے سینے میں سیتل کا دل آ گیا ہو۔ وہ سیتل جو ہنستے کھلتے کھیتوں کھلیانوں سے گذرتا نہ معلوم کہاں جا رہا تھا۔ جب وہ بہت دور چل کر دھوپ کی تپش میں پسینے سے شرابور گھنے درختوں میں پہنچا تب اسے کسی قدر اطمنان محسوس ہوا۔ وہ کچھ دیر وہاں لیٹا رہا۔ آرام کرنے کے بعد اپنے معمول کے کام پر چلا گیا۔ جگہ جگہ اپنی گرفتاری کے اشتہار دیکھتا اور تھوڑا تھوڑا مسکراتا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک نسوانی آواز نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ گولی کی آواز ماحول کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔ دوسری گولی چلانے لگا تھا کہ ایک آواز آئی۔ ابھی تم نے ایک کی عزت بچائی اور اب تو ان لو ہے۔ زیورات کے لالچ میں اس کا قتل کرنے لگا ہے کے یہ اس کا ضمیر تھا۔ اس کی بندوق رک گئی۔ کتنے گناہ، کتنے قتل اور کتنے جوانوں کو ماؤں کی گود سے نکال کر قتل کیا۔ کتنی ماؤں بہنوں کا سُہاگ لوٹ لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لمحے بھر کے لئے جیسے وہ ایک عام قسم کا نارمل انسان بن گیا ہو۔ وہ سوچنے لگا کیا

میں یہ سب کچھ نہیں چھوڑ سکتا؟ آخر میں ایسا کس لئے کرتا ہوں؟ اسی کے ساتھ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسی غیبی آواز سے اس کے سارے بدن میں جیسے جوش سا بھر گیا۔ اور پلک جھپکتے ہی وہ سیتل سے سجن.........

سب لوگوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس قصبے میں ایک خونخوار دہشت گرد داخل ہو چکا ہے۔ جو بھی شخص اس کو زندہ یا مردہ پکڑ لے گا اس کو حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپے کا انعام دیا جائیگا۔ یہ اطلاع سن کر وہ cautious ہو گیا۔ اس کے شیتل دل میں جیسے آگ جل اٹھی ہو۔ اُسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ رات کا وقت دہشت گردی کے خوف سے ہر طرف شمسان سی خاموشی۔ ریڈیو، ٹی۔ وی سے لیکر بجلی کی روشنی تک بند کی گئی ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا۔ سارے چھوٹے بڑے رشتے ناطے فضول نظر آ رہے تھے۔ کیا دوست، کیا دشمن ہر شخص ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ دوسری صبح کو سارا ماحول ایک اور شمشان گھاٹ جیسی خاموشی سے بھرا تھا۔ دہشت گردوں نے ایک گاؤں میں شادی کی خوشی میں ناچتے

گاتے، ہنستے کھیلتے پنتیس نہتے لوگوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ تین دن تک پورے قصبے میں ایک سناٹا ایک ماتم چھایا رہا۔ گھروں میں چولھے نہ جلے، پرندے چہچہانا بھول گئے، تعلیمی ادارے اور بازار بند رہے۔ حکومت نے قصبے کی ناکہ بندی کرائی، جگہ جگہ پولیس گشت کرتی نظر آتی۔ تیسرے دن رات کے دس بجے ریڈیو اور ٹی۔ وی سے خبر ملی کہ ایک خطرناک دہشت گرد سیتل عرف سجن نے خودسپردگی کی ہے۔ پرسوں ہوئی گولی (باری) میں جس میں پنتیس آدمی مر گئے تھے۔ وہاں اس کی بیوی اور بچہ بھی مارا گیا تھا۔

مشترکہ آنسو

شادی کو دو مہینے ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی تک اُن کے گھریلو زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ نِشا ہر صورت میں 'اَمر' کی زندگی کو ایک نیا روپ دینا چاہتی تھی۔ اُسے تو خود بھی ایک نئی زندگی شروع کرنا تھی۔ دونوں کو نئی زندگی کی خواہشوں اور تمنّاؤں کے خوشگوار کرتے گلشن دکھائی دے رہے تھے۔ نِشا کا حسین مسکراتا چہرہ میٹھی میٹھی گفتگو (خوش گفتاری) اور ملنسار طبیعت یہ سب کچھ دوبارہ اُبھر آئے تھے۔ جو ایک نئی شادی شدہ لڑکی کی میں ہوتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک گھریلو زندگی کے بارے میں دونوں نے کُھل کر گفتگو نہیں کی تھی۔ امر کا خیال تھا کہ نِشا بچی نہیں ہے لیکن دونوں کے دل کسی عجیب سی الجھن میں رہتے۔ پریشانی اور بے چینی دل ہی دل میں دونوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ نگاہوں نگاہوں میں کئی بار دل کی بات کہنا چاہتی لیکن نہ دل کی زبان ہے نہ نظروں کی۔ اگر دل اور نظروں کی بات ہونٹوں تک آ بھی جاتے لیکن دونوں کے ہونٹ سِل جاتے اور گھریلو زندگی حسب معمول چلتی رہی۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ امر ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ امر آج

پہلی بار اتنی دیر تک گھر سے باہر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اتنی دیر نہیں کی تھی۔ ''آج امر کے معمول سے زیادہ گھر نہ لوٹنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے خدا خیر کرے''۔ نِشا کئی طرح کے خدشوں اور واہموں میں ڈوب جاتی۔ وہ خیالات کے گہرے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسی اثناء میں امر سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ نِشا کا وہم خود بخود دور ہوگیا۔ وہ فوراً چارپائی سے نیچے آگئی۔ اور امر کے قریب آ کر گھبرائی ہوئی کہنے لگی۔ ''اتنی دیر تک کہاں تھے۔ خیریت ہے نا؟ یہ بچہ.....ارے یہ کس کا ہے؟ دیکھو کتنا پیارا سا ہے؟'' وہ بچے کو جلدی جلدی چمکارتے ہوئے کہنے لگی۔

امر چارپائی پر بیٹھ گیا اس کا چہرہ اداس اور پریشان سا لگ رہا تھا۔

اس کی حالت قابل رحم تھی۔ امر کافی دیر تک چارپائی پر بیٹھا سوچتا رہا۔ سچائی بیان کرے تو کیسے۔ بات تو چھوٹی سی ہے؟ لیکن اتنی سی بات سے گھریلو زندگی میں ایک طوفان کھڑا ہوسکتا ہے۔ وہ سوچتا ہی رہا۔ اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اِدھر سے نِشا امر کی خاموشی سے پریشان ہورہی تھی۔ کتنی دیر سوچتا رہا... مگر کیا؟ اتنے میں آواز آئی... ''کتنا پیارا سا بچہ ہے؟ یہ کس کا ہے؟'' امر نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے

جواب دیا..... ''نشا دیکھو۔ انسان کو حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ اگر انسان حالات سے سمجھوتا نہ کرے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے۔ اگر انسان دل کی بات کہدے یا اپنی غلطی تسلیم کرے تو اُسے معاف کر دینا چاہیئے''۔ یہ سن کر نشا حیران نظروں سے امر کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سوچنے لگی آج امر کیسی پہیلیاں بُجھا رہا ہے۔ ''نشا دیکھ نیتو میری بچی ہے۔ میں نے آج تک یہ راز تمہارے سامنے نہیں کھولا تھا۔ وہ صرف اس لئے کہ نہ معلوم تیرے دل پر کیا گذرے گی۔ یا یہ سوچتا تھا کہ تجھے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی معلوم ہو جائیگا۔ لیکن آج مجبور ہوں۔ اس بچی کو اپنے سے دُور نہیں رکھ سکتا۔ اس کا مستقبل تباہ ہو جائیگا۔ نیتو بچی ہے اسے ماں کا پیار چاہیئے۔ تو ماں ہے اور تیرے پاس ممتا کا سمندر ہے۔ اسی ممتا کے سمندر میں نیتو کو ڈبکی لگانے دے۔ آج سے نیتو تیری بچی ہے۔ امر یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ نِشا کی آنکھوں سے ٹِپ ٹِپ آنسو بہنے لگے۔ وہ نیتو کو گود میں اٹھا کر دیر تک چومتی، پیار دیتی رہی۔ ممتا کے چھلکتے سمندر کو دیکھکر امر کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

وقت گذرتا گیا۔ دونوں کا وقت ہنسی خوشی گذرنے لگا۔ امر
سوچنے لگا کہ اس کی زندگی کا بوجھ سر سے اتر گیا ہے۔ اس کو اپنا آپ ہلکا
محسوس ہونے لگا۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ نیتو کو ماں مل گئی۔ اور وہ
خود بھی پچھلے سارے دکھ بھولنے لگا تھا لیکن نشا کی پریشانی کو امر کی نظریں
سمجھ نہ سکیں وہ نیتو کے ساتھ کھیلتی تھی لیکن دل کے اندر ہی اندر ایک درد
سا اٹھتا اور ممتا کے لہراتے سمندر میں اچانک طوفان اٹھتا۔ کئی بار اس
نے اپنی مجبوریوں پر دل ہی دل میں غور کیا۔ وہ سوچتی تھی کہ جس طریقے
سے امر نے اپنے گذرے کل کو سامنے رکھا۔ ایسا تو مرد ہی کر سکتے ہیں۔
عورت کو ابھی اتنی آزادی نصیب میں نہیں۔ نشا نے کئی بار اپنی غیرت کو
جگایا لیکن اس کے اندر چھپی عورت اسے خاموش کراتی۔ اور وہ کڑوے
گھونٹ پی کر دنیاوی پابندیوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتی۔ امر نوکری
کے سلسلے میں دو تین دن باہر چلا گیا۔ ماضی کی ساری یادوں کو فراموش کر
کے نئی زندگی میں پھر سے داخل ہو کر جب واپس آیا اُسے اپنا گھر بدلا بدلا
سا محسوس ہوا۔ اس کے گھر میں پھر سے نئی بہاریں لوٹ آئیں۔ یہ دیکھ
کر اس کی نظر نیچے گلی میں نیتو کے ساتھ دوسرے بچے کو کھیلتے دیکھ کر پوچھا

''یہ بچہ کون ہے؟ کس کا ہے؟'' ''اپنا ہی ہے'' نشا نے تھوڑی سی ہمت کر کے جواب دیا۔ ''میرا مطلب ہے اپنوں میں سے کس کا ہے؟'' امر نے وضاحت طلب کی۔ ''جس طرح نیتو ہماری بچی ہے اسی طرح 'بابا' بھی ہمارا بچہ ہے۔ یہ دونوں ہمارے ہیں''۔ امر کا ہاتھ نشا کے سر کے قریب ہی تھا لیکن وہ جلدی وہاں سے پرے ہٹ رہا اسے اپنے کانوں پر جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔ کتنی دیر اسکی طرف دیکھتا اور کیا کچھ سوچتا رہا۔ غصے سے اس کا رنگ یکا یک لال پیلا ہو گیا۔ جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔ ''مجھے دھوکے میں کیوں رکھا تھا'' امر کو غصے میں یہ بھی یاد نہ رہا۔ کہ کچھ دن پہلے اس نے بھی اپنے بچے کو نشا کی گود میں ڈال دیا تھا اور نشا نے کسی قسم کے غصے یا کسی سوال جواب کے بغیر اس بچی کو اپنی گود میں بڑے پیار کے ساتھ لیا تھا۔ نشا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ ''امر۔ بابے کا باپ تین سال پہلے ایک ایکسی ڈنٹ میں مر گیا تھا یہ اُسی کی نشانی ہے۔ میرے بچے کو باپ کے پیار کی ضرورت ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی تھی لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے تمہارے سامنے یہ سچائی نہ رکھ سکی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ دن بھی دیکھنے ہونگے۔

کڑواہٹ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کئی بار یہ بات زبان پر آئی لیکن میں نے ٹال دیا۔ ہم پیار میں اتنے ڈوبے تھے کہ ہم ماضی اور مستقبل سب کچھ فراموش کر گئے۔ بابے کو میں اپنے میکے میں رکھ سکتی تھی لیکن سچائی کو کتنی دیر چھپاتی"۔

"تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ تو پہلے بھی یہ کہہ سکتی تھی۔ ضروری نہیں کہ یہ بچہ تیرا ہی ہو۔ یہ کسی اور کا بھی ہوسکتا ہے۔"

نشا امر کے قدموں میں گر گئی۔ نہیں، نہیں امر اس میں کوئی فراڈ یا دھوکہ نہیں ہے۔ مجھے معاف کرو۔ بچے پر رحم کرو۔ یہ معصوم بچہ باپ کے لئے ترس رہا ہے۔"

اب امر سے رہا نہ گیا۔ اس کے اندر کا انسان بیدار ہوا اور نشا کے سر سے کھینچا ہوا ہاتھ پھر بڑھا کر تینوں کو اپنی مضبوط باہوں میں گھیر لیا۔

دہلیز

سمٹے سمٹائے جیسے لیٹا ہوا اسپر یت پرانے کپڑوں کی گٹھری سے بالکل مختلف نہیں لگتا تھا، ہسپتال کے کوریڈو سے چلتا ہوا دور سے دکھائی دیا۔ آنکھیں کاریڈور کی طرف جاتے ہوئے کسی کے انتظار میں لگئی دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے سامنے کھڑا آتا دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا۔ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے تکیہ سے سہارا دے کر اُسے بٹھایا۔ ''بخار نہیں اُترتا ہے'' وہ نحیف سی آواز میں کہنے لگا۔ ''یہاں تمہارے پاس اور کوئی نہیں ہے''؟ میں نے اس کی قابل رقم حالت دیکھ کر مغموم ہو کر کہا۔ ''کبھی کبھار۔ مامی جی آتی ہے۔ ماما جی ڈیوٹی دینے کی وجہ سے آ نہیں سکتے۔ بس نظر مار کر جاتے ہیں۔ فون پر خیر خیریت بھی پوچھ لیتے ہیں۔ ٹیبل پر چائے رکھی ہے۔ پی لو۔ بعد میں خراب ہو جائے گی''۔ لگتا تھا وہ میری باتوں کو ٹال رہا تھا۔ اس کا چہرہ پیتل کی طرح ہو گیا تھا جیسے اس کے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ ''کیا تم کو بھی پینی ہے؟ تمہیں بھی تھوڑی دیدوں'' میں نے ٹیبل پر رکھی کیٹل کو اٹھایا اس میں چائے کافی تھی۔ ایک کپ اُسے بھی دیا۔

چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے میری نظر ٹیبل پر رکھے نُسخوں پر پڑی۔ ''لکھا تھا بُخار ہے۔اور ڈاکٹروں نے کچھ ٹیسٹ کرانے کی بھی تجویز دی ہے''۔ مجھے نسخے دیکھتے ہوئے خود ہی کہنے لگا۔ٹیسٹوں سے (HIV-P) پڑھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔اس کا پیتل جیسا زرد چہرہ دیکھ کر میرے دل کی حالت قابل رحم ہونے لگی۔ان ٹیسٹوں کے بارے میں پڑھ کر بھلا کون نہیں ڈرتا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ محسوس کرے میں اوپرے دل سے دوسرے بیماروں کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔اور پریشانی کو دل کے اندر چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔رب ایسا نہ کرے میں دل ہی دل میں اندونی پریشانی کو دبائے ظاہری خوشی کا اظہار کرتے ہوئے واپس آکر اس کے پاس آبیٹھا۔

''تم یہ ٹیسٹ کراؤ گے۔ڈاکٹر نے جلد سے جلد اسے لانے کو کہا ہے''۔

سنتے ہی میرے قدم لیباٹری کی طرف چل پڑے۔ٹیکنِشن نے دوسرے دن لے جانے کو کہا۔اور کچھ دیر ٹھہرنا چاہتا تھا۔اُسے ہسپتال میں ہفتہ بھر ہو گیا تھا۔مگر مجھے آج ہی اس کے پاس اُسے دیکھنے کی

فرصت ملی۔ کر بھی کیا سکتا۔ دور کا فاصلہ ادھر سے اپنی ہزروں پریشانیاں۔ وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اتنے میں خود ہی کہنے لگا "اب تم جاو دیر ہو جائے گی۔ کل اگر فرصت ملی تو پھر آنا"۔ اس سے الگ ہونے کو جی نہیں کرتا تھا۔ اور اس کا ہے بھی کون۔ مامی ماما اور بوڑھی نانی جس کے ساتھ وہ اپنے دُکھ سُکھ بانٹتا ہے دیر ہوتی دیکھ کر پھر کہنے لگا۔ تم جاو۔ مگر ضرور آنا۔ تمہارے ساتھ بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ کتنی دیر سے تم سے باتیں نہیں ہوئیں۔ کیا تمہیں یہاں آنا اچھا نہیں لگتا ہے۔ "نہیں نہیں میں کل سویرے ہی آوں گا۔ کیوں کہ تیرے ٹیسٹ بھی لانے ہیں نا" ٹیسٹ کے بارے میں سوچ کر میرے دل میں کئی قسم کے سوال پیدا ہو رہے تھے۔ "اچھا اجازت دو۔ کل ضرور آوں گا"۔

چھوٹے چھوٹے قدموں سے لڑکھڑاتا جس وقت وہ پہلے پہلے سکول سے لوٹ آتا نانی نے دیکھا۔ خوشی سے پھولے نہیں سمائی اسے اپنی گود میں لے کر دیر تک چومتی رہتی۔ اور وہ خوش ہو کر نانی کے سینے سے لگ جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب نانی سُپریت کو اپنے گھر لے آئی۔ وہ دنیا کی بھلی بُری

سے نا آشنا اور بے خوف۔ پنپتا سرو قد گلاب جیسا رنگ رُوپ، خوشی سے اس کا انگ انگ ڈھلکتا وہ تو مسرتوں کا دن تھا۔

اکتوبر کی میٹھی میٹھی ٹھنڈ۔ نرم نرم دھوپ ۔نانی کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں دروازے کے اندر پاؤں رکھتے ہی چھلک پڑیں۔ جیسے اس کا سینہ پھٹ رہا تھا۔ نانی کا سارا غم آنکھوں کے راستے جیسے باہر نکل آیا ہو۔ پاس پڑوس والے سب تسلی دینے لگے۔ سُپر یت کا نکلتا ہوا قد گورا گورا ررنگ روپ، چہرے سے ٹپکتی خوشی ایک لمحے میں اوجھل ہوگئی۔ اور وہ نانی کے سینے سے جا لگا۔ میں اکثر سُپر یت کے گھر جاتا تھا، اس کی نانی بچوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی اسی وجہ سے دوسرے بچے بھی ان کے گھر آیا کرتے۔

سُپر یت کی ممی اچھپال سے عمر میں چھوٹی تھی۔ وہ اس جوان کو چھوڑ کر کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ سُپر یت کی نانی کی جتنی بھی عزت آبرو لوگوں میں تھی پل بھر میں ملیا میٹ کر گئی۔ باپ سے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ نانی کے حوالے کر گیا۔ کئی دن باپ آتا جاتا رہا بعد میں وہ بھی ایک خواب ہی ثابت ہوا۔ وہ کہاوت ہے نا ماں مرگئی تو

باپ پرایا لیکن ماں مرگئی ہوتی تو اور بات تھی۔ جو مار اس نے ماری اس سے شرم وحیا کی ساری حدیں ملیا میٹ ہوگئیں۔ سُپر یت کو نانی ہی یہ سب کچھ بتاتی۔ بزرگ لوگ کہا کرتے تھے ''اصل سے سُود میٹھا''۔ نانی نے بھی اپنے دل کا سارا پیار اسے دیا۔ وہ آس پاس ذات برادری کی ہر بُری بھلی باتیں سن کر ان سُنی کر دیتی۔ گھر میں ساس بہو کے بیچ کبھی کبھی تُو تُو میں میں بھی ہوتی حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا۔ لیکن قد کاٹھ سے میرا ہم عمر لگتا تھا۔ میں نے کالج میں ایڈمیشن کیا اور اس نے سکنڈری سکول میں۔ اب ہماری ملاقات کم ہی ہوا کرتی۔ وہ دیر سے ملنے کی وجوہات مجھے بتا دیتا۔ ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ وہ ماں باپ کی کمی محسوس کرنے لگا۔ اسی عمر میں تو بچوں کو ماں باپ کی ہمدردی لاڈ پیار، کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس کی جگہ لڑکی ہوتی اس کی زندگی ہی مرجھا گئی ہوتی۔ اس کی شکل وصورت نکھرنے لگی تھی۔ نکھرتا بھی کیوں نہیں۔ وہ تو اب جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔

ایک دن میں اس کے گھر گیا۔ وہ کتابوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ میرے آنے پر بہت خوش ہوتا تھا۔ لیکن آج نظر بھی نہیں ملا رہا تھا۔ میں

سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے کیونکہ میں بہت دنوں بعد اس کے گھر گیا تھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر گردن اوپر اٹھائی۔ وہ سرد آہ بھر کر دیکھنے لگا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ ''دیکھو سپریت خوب پڑھ لکھ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مامی نے تو کچھ نہیں کہا کوئی بات نہیں میں اُسے سمجھاؤں گا''۔

دوسرے دن ہڑتال کی وجہ سے ٹریفک بند تھا۔ میں ہسپتال دیر سے پہنچا۔ اس کے ٹیسٹ کے بارے میں سوچ کر میں کانپ اٹھتا۔ میں سیدھا سپریت کے وارڈ میں پہنچا۔ سپریت وہاں نہیں تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میرے ذہن میں کئی بُرے خیالات ابھرنے لگے لیکن ایک نرس سے پتہ چلا کہ اُسے الگ وارڈ میں داخل کیا گیا ہے۔ میرے تو ہوش اڑنے لگے۔ بیڈ پر گُم سُم لیٹے ہوئے تھا نرس اسے انجکشن لگا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے ٹول پر بیٹھنے کو کہا۔ میری آنکھیں اس کے پیش آنے والے دُکھ درد کے احساس سے بھر آئیں۔ کچھ دیر اس کے ساتھ بات بھی نہ کر سکا۔

وہ اُسی طرح سمٹ سمٹا کر نظریں میری طرف کر کے چپ چاپ

دیکھتا رہا۔ اس کی خاموش مری مری سی آنکھیں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ جوانی میں ماں باپ کے بنا اپنے آپ کو سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی وقت پر جو لوگ جوانی کی دہلیز پر آنکھیں بند کر دیتے ہیں۔ یا جانے انجانے غلط راہ لگتے ہیں اور مستقبل کی نبض نہیں پہنچانتے۔ اندھے کنویں میں گر جاتے ہیں۔ ہم دیر تک خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ میرے اندر کے آدمی نے مجھے خاموش رہنے کی صلاح دی۔ میری خود کی عزت نفس مجھے گھیرنے لگی۔ لیکن میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو مجھ سے ہر بات کہتا تھا پر یہ کیسے ہو گیا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا۔ نہیں نہیں کچھ اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ "کیا بات ہے تو کچھ بولتا ہی نہیں؟"۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے دیر ہو گئی" "کوئی بات نہیں مامی جی آ گئی تھی" اس کے جواب سے میرے دل میں اٹھنے والے کئی سوال ٹل گئے۔ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ یونہی بات کو ٹال رہا ہے۔ اس نے فوراً کروٹ بدلی۔ میں نسخوں کو دیکھنے ہی لگا تھا کہ اس کی سسکیوں کی آواز سی آنے لگی۔ اس کا مُنہ اپنی طرف گھمایا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے گیلی ہو گئی تھیں۔ مایوسی دُکھ اور غمگین چہرہ اس کے

آنیوالے وقت کی گواہی دے رہے تھے میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ کچھ دیر تک دونوں آنسو بہاتے رہے۔ "پگلے روتا کیوں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بہادر انسانوں کے ساتھ بڑی بڑی تکلیفیں پیش آتی ہیں"۔ وہ میری جھوٹی تسلی کو سمجھ رہا تھا۔ سپریت کو اس بیماری کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ چھوٹا تو نہیں تھا۔ "لیکن یہ تو بتا کہ کہاں اور کیسے یہ چُوک ہو گئی تو تو معمولی سے معمولی بات بھی مجھے بتاتا تھا۔ دیکھو جو ہونا تھا ہو گیا۔ پھر نہ کچھ ہے جسے تو مجھ سے چھپا رہا ہے۔ دوستوں سے بات نہیں چھپائی جاتی۔ پھر یہ کہ بات چیت کرنے اور دکھ سُکھ بانٹنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اگر انسان دوستوں کیساتھ دکھ درد نہ بانٹے تو کس سے بانٹے"۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل اتنی دیر تمہارے ساتھ بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکا"۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ تو مجھ سے عمر میں چھوٹا ہی تھا اور ہو سکتا ہے بات کہنے کے لایق نہ ہو۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "یہ سب کچھ چور کی طرح ہی ہوا۔ میں نے یہ بات سوچی بھی نہ تھی۔ میں ابھی ان لمحوں کو

بھولا نہیں ہوں''۔ جو آنے والی زندگی کی نہ بھولی جانے والی یادیں بننے والی تھیں۔ وہ ادیبوں کی طرح بڑے نپے تُلے انداز کے دل موہ لینے والے الفاظ استعمال کرنے لگا۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پوری طرح یاد ہے ہمارے گھر مہمان آئے تھے ایک عورت اور ایک مرد۔ ان کے لباس سے لگتا تھا کہ شادی شدہ ہیں۔ آجکل تو سبھی شادی شدہ لگتے ہیں۔ سویرا ہونے کو تھا۔ نانی اٹھ گئی تھی۔ وہ سویرے ہی گرد وارے جاتی ہے۔ آنکھیں ملتے ہوئے دوسرے کمرے کی کھڑکی اچانک کھولی۔ کھڑکی کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی سوئی ہوئی عورت کروٹ بدل کر میری طرف مڑ گئی۔ عورت کی خواب آلود آنکھوں نے مجھے دیکھنے پر آمادہ کیا۔ بستر سے دکھائی دینے والے اس کے انگ بادلوں سے نکلنے والے چاند کی مانند تھے۔ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارا کیا۔ اس کا مرد پہلے ہی اٹھا تھا میں کھڑکی سے ہی کمرے میں گیا۔ اس نے مجھے اپنے قریب بٹھایا۔ اس کے نرم و نازک انگ مجھے بہت اچھے لگنے لگے۔ اس نے مجھے لٹایا۔ ہم دونوں کچھ دیر تک لیٹے رہے۔ وہ بیچ بیچ میں مجھے بوسے دینے لگی۔ میں بھولا بھالا سا اس

کے پاس لیٹا رہا۔ میں اس کی سفید چٹی بانہوں میں گھرا رہا۔ یہ سب کچھ سادگی میں ہو گیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے ایک جھٹکے سے اٹھایا۔

ایسا لگتا تھا کہ نانی آئی ہیں۔ لیکن میں اصل بات سے انجان اور بے خبر اس کے بستر میں ہی پڑا تھا۔ کہ اس نے میرا بازو پکڑ افوراً اُٹھا دیا۔ اور خود جلدی جلدی کپڑے پہن کر باہر نکل گئی۔ اس طرح چلا جانا میرے دل کو کسی شک میں ڈال گیا"۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی زبان خشک ہو گئی تھی۔ وہ پانی پینا چاہتا تھا، یہ حالات میرے لئے خوفناک منظر سے کم نہ تھے۔ وہ تو رشتے سے میرا کچھ نہیں لگتا تھا۔ لیکن دلوں کا میل بھائی چارے یا قریبی رشتے سے کم نہیں ہوتا۔ کسے معلوم تھا کہ جوانی کی مستی کا پہلا ہی وار اسے دور اور اتنی دور پھینکے گا جہاں سے جوانی واپس ہی نہ آئے۔ پانی کے دو گھونٹ پی کر کہنے لگا۔

"وہ تو چلی گئی لیکن میرے انگ انگ میں ایک نشہ سا بیدار کر گئی۔ اس کے پاس دیر تک لیٹے رہنا، میرے رخساروں کو چومنا اس کے علاوہ نانی کے آنے پر جلدی جلدی اٹھ جانا، میرے بازو پکڑ کر مجھے اٹھا دینا یہ سب کچھ میرا پیچھا چھوڑنے کو بالکل تیار نہیں تھا۔

وہ رات کروٹیں بدل بدل کر گذری۔ کچھ دن بعد یہ سب کچھ جیسے بھول گیا۔ لیکن کوئی ایک ماہ بعد وہ پھر آئی۔ اس کے آنے سے میرے دل میں ایک خوشی سی محسوس ہوئی۔ اُسے دیکھ کر میرے حواس میں ہلچل مچ گئی۔ گذرے مہینے کے الّھڑ پن میں اس کے ساتھ گذرے لمحے نظروں میں گھومنے لگے۔ میں نانی کے پاس سوتے سوتے بڑا ہو گیا۔ نانی کے بغیر مجھے نیند بھی نہیں آتی تھی۔ نانی نے کبھی بھی ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ بچپن اور لڑکپن کا لمبا سفر نانی کی گود میں کھیلتے کھیلتے پورا کیا۔ اور اچانک میری جوانی نے میرے بھولے بچپن اور لڑکپن کی سمادھی کو توڑ ڈالا۔ جوانی کا میرے ساتھ کوئی مناسب رشتہ نہیں تھا۔ وہ چوروں کی طرح آئی اور اس کا سلوک بھی چوروں جیسا تھا۔ پُلس (2+) کا ایگزام تھا۔ وہ آکر میرے کمرے میں سوگئی۔ مامی نے اس کا بستر میرے ہی کمرے میں بچھایا تھا۔ رات کے کوئی گیارہ بج رہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا وہ کپڑے اتار کر ایک چادر اوڑھ کر سوگئی۔ چند لمحوں کے بعد کروٹیں بدل بدل کر میری طرف مُنہ کر کے ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔ اس کے سانسوں کی تپش مجھے پوری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ میری سوچوں کا تانا بانا ٹوٹنے لگا۔ اور میری پوری توجہ اس کے

ایک ایک انگ پر مرکوز تھی۔ اب مجھے نیند بھی آ رہی تھی۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ لیکن اس کی بیقراری میری نیند اڑا رہی تھی۔ وہ بجلی کی طرح تیزی سے اٹھی اور میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے بستر میں لے گئی۔ بے زبان کی طرح بنا کسی انکار کے میں اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ دل ہی دل میں ایک ان دیکھی اور ان جانی خوشی موجیں مارنے لگی۔ پتہ بھی نہیں چلا کہ اس کے جسم کی گرمی سے کب اور کیسے آنکھ لگی۔ اچانک میری نیند کھلی تو اس کا ہاتھ میرے جسم پر پھر رہا تھا۔ شرمیلے پن کی وجہ سے میں اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی سا بن گیا۔ وہ بڑے پیار سے میرے انگ انگ کو چومنے لگی۔ میں اُس جانور کی طرح تھا جس کی نکیل اس کے مالک کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔ بالکل جیسے پہاڑوں سے تیز تیز بہنے والا آبشار۔ ایک ایسا پاگل پن، بے جان بُت جیسا ان حرکات کا مزہ لے رہا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنے کپڑے پہنے۔ اس کے جسم کا انگ انگ تپ رہا تھا اور میں ایک تنور کی مانند دہک رہا تھا اور اسکے قالو میں ایک تیز رفتار گھوڑے کی طرح جیسے سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ عورت کو میں نے ماں کی، نانی کی، دادی کی صورت میں مانا تھا۔ لیکن عورت کی صورت میں میرا یہ

موقع تھا۔ پہلی بار یہ نشہ دیکھ کر میں کبھی سیر نہیں ہوا۔ اب بغیر کچھ کہے سُنے وہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیتی۔

اُس رات یہ سلسلہ کئی بار چلتا رہا۔ پتہ بھی نہ چلا کہ صبح کب ہوئی، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ اٹھ گئی تھی۔ چور چوری کر گیا لیکن جس چور کو وہ میرے اندر داخل کر گئی وہ میرے خون میں سرایت کر گیا۔ جوانی نے دستک تو دی لیکن بہت خوفناک سی۔ جیسے کوئی راکھشس دروازہ توڑ کر اندر آیا ہو۔ اس کے پیار کا بہانا اندر ہی اندر کچھ کہتا اور اس کے پاس جانے کو دل بے چین ہو اٹھتا۔ اس کے بدن کی خوشبو میری رگ رگ میں رچ بس گئی۔ اس کے جانے کے ساتھ ہی مجھے اپنے آس پاس سب کچھ اداس اور پژمردہ لگتا تھا۔

نانی نے زندگی کے سارے دور طے کئے تھے۔ اب اس کے آگے کچھ نہیں تھا۔ وہ میری جوانی کی حفاظت کرنے لگی۔ لیکن پنکھ والے پرندے کو ماں اپنے پروں کے نیچے کب رکھ سکتی ہے جو کانٹے وہ میرے پیروں تلے بچھا گئی ان کے زخموں کی کسک مجھے اندر ہی اندر سے جونکوں کی طرح چُوستی رہی۔ میرے قدم خود بخود کھینچ کھینچ کر مخواہ گھر سے باہر چلتے

جاتے۔ نکلے تو اور باہر نکل گئے۔ نانی اپنی حفاظت پوری کر گئی۔ مُڑ کر دیکھا ہی نہیں آج یہاں میرے ضمیر نے آنکھ کھولی"۔

اس کا انگ انگ بخار اور درد کی پیڑا سے تپ رہا تھا۔ "چائے کا ایک کپ دینا"۔ وہ زبان نکال کر دکھانے لگا۔ "کتنی خشک ہو رہی ہے؟" "ابھی تو پی تھی"۔ "معلوم نہیں چائے پینے کو دل کیوں کرتا ہے"۔

وہ جلدی جلدی باتیں کرنے لگا۔ مجھے اس کی بیماری کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی اس کے آنیوالے وقت کی تھی۔ وہ اتنا کمزور (لاغر) ہو گیا تھا کہ پہلو بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ چائے کے دو تین گھونٹ اس کے گلے سے اترے ہی تھے کہ اتنے میں اچھپال بھی آ گیا۔ ماحول میں کچھ خاموشی سی چھا گئی۔ وہ میری اور ماموں اچھپال کی آنکھوں میں تھوڑا جھانک لیتا لیکن ہمت کی دہلیز پر پاؤں دھرنے کا موقع ہاتھ نہیں آتا تھا۔